ماہنامہ

فکرِ نو

علی گڑھ

مدیر

ریاض الرحمٰن شروانی

ماہنامہ
فکرِ نو
علی گڑھ

مدیر
ریاض الرحمٰن شروانی
معاون مدیر
ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں

سال دوم ☆ جنوری ۲۰۱۹ء ☆ شمارہ نمبر (۶)

قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے
قیمت سالانہ: ۱۵۰ روپے

فہرست

اداریہ		۲
رحم اور انصاف کی تشریح	ہرش مندر	
	مترجم: پروفیسر افتخار عالم خاں	۴
تحفۃ المجاہدین کا ایک مطالعہ	پروفیسر سید احتشام احمد ندوی	۸
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک قیمتی ذخیرۂ مخطوطات (جواہر میوزیم) اور اسکے بانی، اٹاوہ کے خان بہادر بشیر الدین کے بارے میں		
	ڈاکٹر شائستہ خاں	۱۰
اے کاش تیرے دل میں اتر جائے میری بات!	الحاج اخلاص احمد شروانی	۱۷
ماضی کے دریچوں سے		
اہل کتاب-۳	مولانا مناظر احسن گیلانی	۲۰
تبصرے	ب ع ر	۳۲
مراسلہ	پروفیسر اصغر عباس	۴۸

پبلشر مسز غزالہ پروین نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزز علی گڑھ سے چھپوا کر حبیب منزل، میرس روڈ علی گڑھ سے شائع کیا

اداریہ

کرتارپور کوریڈور

اعلان ہوا ہے کہ پاکستان کی حکومت سرحد سے چار کلومیٹر فاصلے تک کرتارپور تک کوریڈور کھولے گی تاکہ گرونانک جی کے ۵۵۰ ویں یوم ولادت پر سکھ برادری عبادت کے لیے وہاں آجا سکے۔ یہ بظاہر ایک اچھی خبر ہے جس کا سب کو خیر مقدم کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ کئی مخمصے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ عنایت سکھوں ہی پر کیوں ہے دوسری برادریوں کے اسی قسم کے مواقع کیوں نظرانداز کئے جارہے ہیں۔ اس کا جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ان کا ۵۵۰ واں یوم ولادت ہے۔ اور ان کے ماننے والے ان کے پیرو بڑی تعداد میں وہاں حاضر ہونا چاہیں گے۔ لیکن کیا دوسرے فرقوں کے مقدس مقامات کے لیے یہی رویہ اختیار کیا جائے گا۔ دراصل اس کی ایک بڑی تاریخ ہے اورنگ زیب کے عہد سے تقسیم ہند تک کئی مرتبہ سکھوں اور مسلمانوں کا مقابلہ ہو چکا ہے اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ ان پر مہربانی کا یہی سبب تو نہیں ہے؟

متحدہ ہندوستان میں سکھ ایک اقلیت تھی؛ اور زیادہ بڑی اقلیت بھی نہیں تھی۔ دوسری طرف آر ایس ایس انہیں ہندو سماج ہی کا حصہ مانتی ہے اس کا کہنا ہے کہ جو مذاہب ہندوستان سے نکلے ہیں اور کہیں باہر سے نہیں آئے ہیں وہ ہندو سماج کا حصہ ہیں۔ اقلیتیں وہ ہیں جن کے مذاہب ہندوستان سے باہر سے نمودار ہوئے اور پھر ہندوستان میں آگئے۔ اگرچہ خود سکھ اس سے انکار کرتے ہیں، وہ اپنے کو ہندو سماج کا حصہ نہیں مانتے تاہم ان کے لئے بڑی تعداد میں ہندوؤں کے دلوں میں نرم گوشہ موجود ہے۔ جب کہ ۱۹۸۴ء میں ان کے ساتھ ہندوستان میں جو ظلم و زیادتی ہوئی اس سے آر ایس ایس کے لوگ بہت غم زدہ ہیں۔ غم زدہ ہونا ہمیں بھی چاہیے۔ ہر ظلم قابل مذمت ہے لیکن سب کے ساتھ یکساں رویہ ہونا چاہیے۔ یہ انصاف سے بعید ہے کہ ایک طبقہ کے ساتھ ایک رویہ اور دوسرے طبقہ کے ساتھ دوسرا رویہ۔

دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے موقعے پر پنجاب میں مسلمانوں کے خلاف سب سے زیادہ غصہ اور ظلم و زیادتی کا مظاہرہ سکھوں ہی نے کیا تھا، اور ہندو پس پشت تھا نئی سرحد کے دوسری طرف مسلمان سکھوں کے ساتھ زیادتیاں کررہے تھے۔ اس کے بعد مدت تک مسلمان اور سکھ ایک دوسرے سے خوف زدہ

رہے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ پاکستان سکھوں کی طرف ملتفت ہوتا گیا، اس کے سیاسی اسباب تھے۔ اگر قائدین مسلم لیگ کی نگاہ تقسیم سے قبل ان اسباب کی طرف ملتفت ہوئی ہوتی تو پنجاب تقسیم نہ ہوتا۔ اور نتیجتاً شاید ہندوستان بھی تقسیم سے بچا رہتا۔ لیکن مسلم لیگ کے قائداعظم تقسیم پر بضد تھے۔ ہمارے بعض قارئین کو یہ ضرور یاد ہوگا کہ جب لاہور میں پنجاب کی اسمبلی میں مسلمانوں نے تقسیم ہند کی حمایت کی اس وقت سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اسمبلی سے باہر آکر اپنی کرپان نکالی اور کہا کہ اب فیصلہ اس سے ہوگا۔ جب کانگریس نے یہ سمجھ لیا کہ حکومت برطانیہ آزادی کی قیمت تقسیم ہند کو قرار دیتی ہے تو اس نے صوبوں کی تقسیم کو پاکستان کی قیمت قرار دیا۔ کانگریس کے لیڈروں کو یہ دھوکہ تھا کہ مسلم لیگ اس قیمت پر پاکستان قبول نہیں کرے گی۔ لیکن مسلم لیگ کے قائداعظم پاکستان کے لیے ہر قیمت پر بضد تھے۔

یہ موقع تھا کہ مسلم لیگ نے دوسری اقلیتوں کو اپنا ہمنوا بنایا ہوتا تو آج صورتحال مختلف ہوتی۔ یہ شک وشبہ کی فضا نہ ہوتی۔ شاید ایک طرف پنجاب اور بنگال تقسیم نہ ہوتے اور دوسری طرف شاید پورا ملک تقسیم سے بچ جاتا۔

بہر حال جو ہونا تھا وہ ہوگیا اب سب کی بہتری اس میں ہے کہ ہندوستان پاکستان کے تعلقات خوش گوار رہیں۔ لیکن دونوں ملکوں میں جو چار جنگیں ہوئی ہیں انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے جو فیصلہ بھی دونوں طرف سے کیا جائے اس میں ماضی اور حال کے سب پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اور اس کی ابتدا دونوں ہی طرف سے ہونا چاہیے۔ اگر پاکستان سکھوں کو ہندوستان کے خلاف استعمال کرنا چاہے گا تو حربے ہندوستان کے پاس بھی ہیں وہ بھی انہیں آزما سکتا ہے، لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ اس سے ایک طرف دونوں ملکوں کے تعلقات اور زیادہ خراب ہوں گے اور دوسری طرف جو جو حربے استعمال کئے جائیں گے خود انہیں بھی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو اقدام تعلقات کی بہتری کے لیے کیا جائے اس میں سب کو شامل کیا جائے، محض بعض فرقوں یا طبقوں کی شرط نہ رکھی جائے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ دونوں ملکوں میں آمدو رفت کے ذرائع بہتر سے بہتر ہوں تاکہ بدگمانیاں دور ہوں اور دونوں ملک کے باشندوں کے ذہنوں سے شکوک رفع ہوں، اور دونوں ملک ایک دوسرے کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار سکیں۔ دونوں ملکوں میں ایسے بزرگ آرام فرما ہیں۔ لوگ وہاں جانا چاہتے ہیں اور ان سے برکت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ کوریڈور ایک محدود علاقے میں کسی مخصوص فرقے کے لیے کھولا جائے بلکہ اس کے حدود وسیع ہونے چاہئیں اور دونوں طرف کے باشندے جو ایسا سوچتے ہیں وہ سب بزرگوں سے برکت حاصل کرسکتے ہیں۔

ریاض الرحمٰن شروانی

رحم اور انصاف کی تشریح

ہرش مندر
مترجم: پروفیسر افتخار عالم خاں

(نوٹ:۔ ہرش مندر ایک آئی اے ایس افسر تھے۔ انہوں نے ۲۰۰۲ء میں گجرات فسادات کے بعد سول سروس سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور جب ہی سے انسانی حقوق اور سماجی انصاف کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اُن کی چار سو صفحات پر مبنی حالیہ کتاب بعنوان Looking away کے چند صفحات کا ترجمہ اس مضمون کے بطور پیشِ خدمت ہے)۔

۲۰۱۳ء اور ۱۴ کے موسم سرما میں، ہندوستان میں دو لوگوں کو پھانسی دی گئی تھی، یہ دونوں ہی دہشت گردی کے مجرم تھے، ان میں سے ایک یعنی افضل گرو کے بارے میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، دوسرے اجمل کصاب تھا جو بمبئی کے ۲۸/۱۱ کے دہشت گردانہ حملے میں پکڑا گیا تھا۔

لیکن ۸/اگست ۲۰۱۳ء کو ایک اور گمنام قبائلی کسان، مگن لال کو اپنی ۵ بیٹیوں کے قتل کے جرم میں جبل پور جیل میں پھانسی دی جانے والی تھی۔ اتفاقیہ طور پر پھانسی دیئے جانے کے صرف ایک رات پہلے انسانی حقوق کے وکلاء نے انٹرنیٹ پر اس پھانسی کے سلسلے کی اطلاع دیکھی تھی وہ فوراً ہی چیف جسٹس سیتھا سیوم کے بنگلے پر پہنچ گئے تھے۔ موت اور زیست کا سنگین معاملہ ہونے کی وجہ سے چیف جسٹس نے اسی شام ان کی اپیل کی سنوائی کو منظور کرتے ہوئے تحریر کیا کہ پریسی ڈینٹ کے رحم کی درخواست کو نامنظور کرنے کے بعد بھی پھانسی کے ملزم کو پریسیڈینٹ کی نامنظوری کے خلاف اپیل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

مگن لال نہایت مفلس اور غریب تھا اس میں یہ استعداد نہیں تھی کہ وہ اعلیٰ عدالتوں کے وکیلوں کی فیس کا بار اٹھا سکتا۔ وہ آج مر گیا ہوتا، اگر انسانی حقوق کے سرگرم وکلاء (جیسے لوگ موہن چوہدری، سدھارتھ اور کولین گون سالو وغیرہ) نے بروقت مداخلت نہ کی ہوتی، جسٹس سیوم نے پھانسی پر روک لگا دی تھی۔

میں جن وجوہ سے ان کی سزائے موت کی مخالفت کر رہا ہوں اس میں نہ تو اس کے جرم کا گھناؤنا پن ہی شامل ہے اور نہ ہی اس کی موت کی سزا کے حکم کے صحیح یا غلط ہونے کی بحث درکار ہے، میری تو ساری توجہ موت کی سزا کے مجرمین میں موجود شدید طبقاتی تعصب پر مرکوز ہے۔ یہ صرف اتفاق نہیں ہے ۲۰۱۲ء کے اخیر تک ہندوستان میں پھانسی دیے جانے والے سب ہی ۴۱۴ افراد نہایت ہی مفلس اور غریب تھے اور پوری طرح سے مفت قانونی مدد فراہم کرانے والے وکلاء کے مرہون منت رہے تھے میں مگن لال کے خاندان کے افراد سے ملنے کے لیے گیا تھا، وہ ایک قبائلی گاؤں کنیریا (Kaneria) کے باہر باریلہ کے علاقہ میں رہتے تھے جو مدھیہ پردیش کے سیہور ڈسٹرک میں واقع ہے۔ ان کا جگہ جگہ سے گرتا ہوا کچا مکان، ان کے بچوں کی بیماری زدہ جلد اور بالوں کی پھیکی زرد رنگت ان کے لاغر جسم اور تھکے ہوئے چہرے ان کی بے رحم زندگی اور ان کی مفلسی اور محتاجی کی غمازی کر رہے تھے۔

مگن لال کے بھائیوں اور اس کی دو بیویوں نے ہمیں بتایا تھا کہ اگر برسات اچھی ہو تو اس سال برسات کے بعد کے کچھ مہینوں تک کھانے پینے کے لئے وہ اس اناج پر منحصر رہتے ہیں جو وہ اپنی ایک ایکڑ زمین میں پیدا کر لیتے ہیں، اس کے ختم ہونے کے بعد چند مہینوں وہ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ملنے والی مزدوری کی آس میں جیتے ہیں یا پھر جنگل سے لکڑیاں چن کر بیچتے ہیں جس میں دن بھر کی محنت کے بعد چالیس روپیہ تک کما لیتے ہیں۔ مگن لال کے گرفتار ہونے کے بعد بھائیوں نے مل کر پانچ ہزار روپیہ جمع کئے تھے اور اس روپیہ سے ایک مقامی وکیل کو مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے کھڑا کیا تھا لیکن جب مگن لال کو نچلی عدالت سے سزا ہوگئی تھی تو اس کے بعد کیا قانونی کاروائی ہوسکتی ہے یا کرنی چاہئے اس کا انہیں کوئی علم نہیں تھا۔ پھر یکایک ایک دن ان کو مگن لال کو پھانسی دیئے جانے کا نوٹس ملا تھا۔

مگن لال کے مقدمہ کی پیروی قانونی لاء فراہم کرانے والے وکلاء نے کی تھی جو نہ تو اس سے واقف تھے اور نہ ہی اس سے پہلے کبھی ملے تھے۔ سپریم کورٹ نے اپنی عام روایت سے ہٹ کر اس کے مقدمہ کی سنوائی کرنا تو کجا اس کی اپیل کی درخواست منظور کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی کسی مشہور وکیل نے وکالت کی ہوتی اور خاص طور پر کسی ایسے وکیل نے جو اپنے زمانے کے عموماً نامی گرامی وکیل ہوتے ہیں تو یقیناً آج مگن لال کے مقدمہ کے فیصلے کی نوعیت دوسری ہوتی۔

اس کے گاؤں میں چند گھنٹے گزارنے کے دوران ہی ہمارے سامنے ایسی شہادتیں آئی تھیں جو اگر اس کو قطعی بے گناہ تو نہیں لیکن ایک غیر معمولی نوعیت کا ایسا مجرم بھی نہیں ٹھہراتی تھیں جو سزائے موت کا مستحق ٹھہرایا جائے۔ ان میں سب سے اول تو اس کی شدت غربت ہی تھی، دوسرے صرف اس کے بھائیوں اور بیویوں نے ہی نہیں بلکہ گاؤں کے دوسرے لوگوں نے بھی اس کے خوش اخلاق اور ملنسار ہونے کی گواہی دی تھی۔ اسی کے ساتھ

اس کے خلاف کسی طرح کا تشدد یا کسی اور مجرمانہ حرکت کی اس سے پہلے کی کوئی رپورٹ موجود نہیں تھی بلکہ وہ اپنی بیٹیوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ گاؤں والوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ قتل کی واردات سے تقریباً تین چار مہینوں پہلے سے اس میں نمایاں تبدیلی واقع ہونا شروع ہوگئی تھی۔ وہ یکا یک خاموش اور اکیلے رہنے لگا تھا اور اکثر گھنٹوں جنگل میں گھومتا پھرتا تھا۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ اس پر کسی نے کالا جادو کر دیا تھا۔ اس رویہ کی بہتر وضاحت اس طور بھی کی جاسکتی ہے کہ وہ ذہنی خلل یا انتشار کا شکار ہو گیا تھا۔ غالباً یہ ذہنی خلل وقتی طور پر دو وقت کی روٹی مہیا نہ کر سکنے کی وجہ سے واقع ہوا ہوگا۔ مجھے بعد میں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جبل پور جیل میں مگن لال کو نفسیاتی امراض کی دوائیں بھی دی جارہی تھیں۔ حالانکہ عدالت کے ذریعہ کسی مجرم کو پاگل قرار دے کر بے قصور ٹھہرائے جانے کی شرائط سخت اور پیچیدہ ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر مگن لال کے دماغی خلل کے سلسلے کی اس کے گاؤں والوں اور پڑوسیوں کی شہادتیں عدالت میں پیش کر دی جاتیں تو کم از کم اتنا ضرور ہوتا کہ عدالت اس کو پھانسی کی سزا نہ دیتی۔

ایک بدنام زمانہ مقدمہ میں ایک نوجوان سیاست داں سوشیل شرما نے اپنی بیوی نینا ساہنی کا قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے ایک تندور میں جلایا تھا اس مقدمہ کے سلسلے میں چیف جسٹس کی سربراہی میں تشکیل کردہ بینچ نے اپنے فیصلے میں کہا تھا کہ یہ مجرم سماج مخالف نہیں ہے، دوسرے درخواست دہندہ کے خلاف اس سے پہلے کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ موجود نہیں ہے جس سے یہ احتمال یا خدشہ نہیں ہوسکتا کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح کے کسی مجرمانہ فعل کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ اس لئے اس کیس کی شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ آئندہ اس درخواست گزار کے سدھرنے کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح یہ سب دلیلیں، مگن لال کے کیس پر بھی صادر آتی تھیں۔ میرا تو صرف یہ واضح کرنا مقصد ہے کہ اگر مگن لال کے گھر والے اس قابل ہوتے کہ نچلی عدالت میں کسی عمدہ وکیل کی خدمات حاصل کر سکتے اور اعلیٰ عدالت میں کوئی نامی وکیل کر سکتے تو مگن لال کی سزا پھانسی کے بجائے نہایت معمولی ہوتی اور اعلیٰ عدالت اس کے مقدمے میں بھی اسی نتیجہ پر پہونچتی کہ یہ سماج کے خلاف اس شخص کا جرم قرار نہیں دیا جاسکتا جس کا اس سے پہلے کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

تو کیا ہم مگن لال کو صرف اس کی غربت کے جرم میں پھانسی کی سزا دے رہے تھے؟ اس سوال کے علاوہ بھی عالمانہ تشریح کے بطور کئی سوال پوچھے جاسکتے ہیں جیسے کہ یہ ہی کہ سماج کیوں ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے جو کسی طور انسانی یا سماجی اخلاقیات کی خلاف ورزی کرتے ہیں؟ کیا اس طریقے سے ہمارا مقصد جرائم کو مزید پھیلنے سے روکنا ہوتا ہے؟ کیا ہم واقعی یہ یقین کرتے ہیں (کہ مگن کے کیس کے بعد) اب دوبارہ کوئی بھی باپ انتہائی غیظ وغضب کے لمحات میں یا پاگل پن کے دوران دوبارہ اپنے بچوں کے قتل سے اس لئے باز رہے گا کہ اس کو پھانسی ہوسکتی ہے؟ (مگن لال کے بھائی نے بتلایا تھا کہ اپنی بیٹیوں کے قتل کے بعد مگن لال نے خود کو پھانسی لگانے کی

کوشش کی تھی، اوراس کے بھائی نے عین آخری لحات میں وہاں پہنچ کر رسی کاٹ دی تھی) یا پھر سزائے موت سے ہمارا مقصداس شخص سے بدلہ لینا ہوتا ہے جو ہماری پسندیدہ اخلاقیات کے قاعدے قوانین کوتوڑ کرایک آدمی کی جان لیتا ہے؟ حالانکہ وہ لوگ جو مگن لال کے جرم سے سیدھے طور پراثر انداز ہوئے تھے یعنی وہ ماں جس کی پانچ بیٹیوں کو ۲۰۱۰ء میں مار دیا گیا تھا اس نے اس جرم کے لئے جس کے عوض عدالت نے مگن کو پھانسی کی سزادی تھی اسے معاف کردیا تھا۔

ان لوگوں نے بتلایا تھا کہ وہ کتنا شفیق باپ اورمہربان شوہر تھا وہ اپنے بچوں کو بے انتہا پیار کرتا تھا انہیں ہمیشہ اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتا تھااوراس واقعے سے پہلے اس نے کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھااس کی غیر موجودگی میں اس کا کھیت اجاڑ پڑا ہے، اس کے بڑے بیٹے کواسکول چھوڑ کر مویشیوں کو چرانے کا کام شروع کرنا پڑا ہے، اس کی بیوی نے کہا تھا کہ ہم توصرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ واپس گھر آجائے اوراپنے خاندان کی پرورش کرے۔اگر وہ سب مگن لال کومعاف کرسکتے ہیں،تو ہم کیوں ایسانہیں کرسکتے ؟

بعدازتحریر:

غالباًاس کے دماغی خلل یااس کی غربت اوراس کومناسب قانونی مدد نہ ملنے کی وجہ سے سپریم کورٹ نے مگن لال کورعایت دے دی تھی اوراس کی موت کی سزاعمر قید میں تبدیل کردی گئی تھی۔

• • •

تحفة المجاهدین کا ایک مطالعہ

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

جس طرح کشمیر میں اسلامی عہدہ اور لقب میر واعظ ہے جو پورے کشمیری مسلمانوں کے نزدیک مقدس ومحترم ہوتا ہے بالکل اسی طرح مالابار میں ''المخدوم'' کا لقب ہے۔ مالابار میں ایک شہر ہے ''پنانی'' جو ساحل سمندر پر ہے۔ یہ شہر مسلمانان کیرالا کے لیے بڑا مقدس تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کا سب سے بڑا پیشوا اور عالم رہتا ہے جو ''المخدوم'' کہلاتا ہے۔ یہ ان کا رہنما ہے۔ مخدوم کی جمع مخادیم آتی ہے۔ یہ مخادیم بڑے عالم ہوتے ہیں انہیں مخادیم نے اصلاً پرتگالیوں سے تقریباً ایک صدی جہاد کیا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں دو اہم یادگاریں چھوڑی ہیں، یعنی زین الدین المخدوم الکبیر نے ایک رزمیہ لکھا ہے جس میں ۱۷۷ اشعار ہیں اس رزمیہ کا نام ہے تحریض اهل الایمان علی جهاد عبدة الصلبان یعنی اہل ایمان کو صلیب کی عبادت کرنے والوں کے خلاف جہاد پر ابھارنا۔ اس عظیم عبقری شاعر کا پورا نام ہے الشیخ زین الدین بن علی الفتانی المعبری المخدوم الاولؒ (۲۰ر شعبان ۸۷۳ھ-۱۴۶۷ء، متوفی ۱۶ر شعبان ۹۲۸ھ-۱۵۲۱ء) وہ کوچین میں پیدا ہوئے اور پنانی شہر میں وفات پائی۔ یہ مخادیم قاضی اور عالم ہوتے تھے۔ انہیں مخدوم اول کے خاندان میں مخادیم پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یہ مذہبی پیشوا تھے۔ ان کو علم وفضل میں اور دین میں پیشوائی اور عظمت کا مقام حاصل تھا۔ جس طرح صدیوں لکھنؤ میں فرنگی محل میں علمائے عظام پیدا ہوتے رہے اسی طرح پنانی شہر میں صدیوں سے علماء پیدا ہوتے رہے۔ ان علماء نے پرتگیزیوں سے طویل جہاد کیا۔ ان مخادیم پنانی نے دو عظیم یادگاریں عربی نظم ونثر میں چھوڑی ہیں۔ زین الدین مخدوم اول جو زین الدین المخدوم الکبیر کے نام سے معروف ہیں۔ انہیں کے پوتے زین الدین المخدوم الصغیر ہیں جنہوں نے اپنے دادا المخدوم الکبیر سے بڑا کارنامہ تحفة المجاهدین کے نام سے پیش کیا۔ تحفة المجاهدین وہ عالمی عظمت رکھنے والی کتاب ہے جس نے پرتگیزیوں کے خلاف ہندوستان کے قومی جہاد کی تاریخ پیش کی ہے۔ اس عظیم علمی کارنامہ کا ترجمہ دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ میں انشاءاللہ الشیخ زین الدین الکبیر کے قصیدہ تحریض اهل الایمان علی جهاد عبدة الصلبان پر بحث ایک مقام میں بعد میں کروں گا۔ اسی طرح شیخ زین الدین الصغیر کی نثری کتاب تحفة المجاهدین فی بعض احوال البرتغالیین پر بھی مفصل بحث پیش کروں گا انشاءاللہ۔

مخدوم کبیر دادا ہیں اور مخدوم صغیر پوتے ہیں جنہوں نے جہاد کی مفصل تاریخ قلمبند کی ہے اور یہ تاریخ ہے اس میں دن تاریخ جنگی کشتیوں کی تفاصیل اور جہاد میں شریک راجہ زموان کی فوج کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہماری قومی زندگی کے اتحاد

کی اعلیٰ مثال ہے۔جس میں ہندواور مسلمانوں نے مل کرایک غیرملکی غاصب طاقت کے خلاف ایک صدی تک جہاد کیا ہے۔ شیخ زین الدین صغیر بن الشیخ محمد غزالی ماھی کے قریب ایک گاؤں میں ۹۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۲۸ھ میں وفات پائی اور پنانی مین ان کی تدفین ہوئی۔

مولانا حکیم شمس اللہ قادری اپنی کتاب ''ملیبار'' میں لکھتے ہیں کہ ملیبار کے دو مصنف ممتاز ہیں ایک زین الدین علی بن احمد المعبری یہ زین الدین المخدوم الکبیر کہلاتے ہیں۔دوسرے زین الدین المخدوم الصغیر کے نام سے مشہور ہیں۔ المخدوم الکبیر نے پرتگیزیوں کے خلاف تحریض اھل الایمان علی جھاد عبدۃ الصلبان لکھی اس رزمیہ میں ۱۷۷ اشعار ہیں۔دوسرے المخدوم الصغیر ہیں جو پہلے مخدوم الکبیر کے پوتے ہیں جنہوں نے تحفۃ المجاھدین فی بعض احوال ابر تفالین لکھی لیکن میری رائے میں ایک تیسرے بڑے مصنف اور شاعر الفتح المبین جیسے عظیم کارنامہ کے انجام دینے والے ہیں اس عظیم رزمیہ میں انہوں نے اس عظیم کارنامہ کا تفصیلی بیان کیا ہے۔جس میں مسلمانوں نے کالی کٹ میں پرتگیزیوں کے قلعہ کو مسمار کردیا اور پھر اس فتح کی یادگار میں قاضی محمد بن عبدالعزیز سالیاتی نے الفتح المبین کے نام سے یہ یادگار رزمیہ لکھی۔اس طرح یہ تیسرا مصنف بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔میں ان تینوں مصنفین پر بحث کرکے ان کی عظمت کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔گذشتہ اوراق میں ان کا ذکر آچکا ہے۔میں سب سے پہلے شمس اللہ قادری کی کتاب ''ملیبار'' سے زین الدین المخدوم الکبیر کی تصانیف کا ذکر تحفۃ المجاھدین فی بعض اخبار البر تغالین: اس کتاب کا خلاصہ حکیم شمس اللہ قادری نے مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے:

''اس میں مصنف نے اپنے وطن ملیبار کے تاریخی حالات بیان کئے ہیں۔کتاب ۴ ابواب پر منقسم ہے۔پہلے باب میں جہاد کے احکام ہیں۔دوسرے باب میں مسلمانوں کے ملیبار میں آنے اور اسلام کی اشاعت کا تذکرہ ہے۔تیسرے باب میں ہندو اقوام کے عادات و رسوم مذکور ہیں۔چوتھے باب میں پرتگالیوں کے ملیبار میں آنے اور یہاں بعض مقامات پر قابض ہوکر اپنے اقتدار کو قائم کرنے کی تاریخ لکھی ہے۔آخر الذکر بیان کتاب کے دو ثلث اجزاء پر پھیلا ہوا ہے جس کی ابتداء ۹۰۴ھ-۱۴۹۸ء سے ہوئی ہے اور ۹۹۱ھ-۱۵۸۲ء کے اختتام تک ۸۷ ستاسی سال کے واقعات خوب شرح وبسط کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں۔یہ کتاب شہنشاہ اکبر ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۵۵ء تا ۱۰۱۴ھ تا ۱۶۰۶ء کے اوسط عہد میں تصنیف ہوئی''۔

مصنف نے چونکہ پرتگیزیوں کے عروج کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لیے ان کے متعلق عینی مشاہدات اور ثقہ مسموعات قلم بند کئے ہیں اور اس موضوع پر ہندوستانی تصنیفات میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ مصنف نے اس کو سلطان علی عادل شاہ والی بیجاپور کے نام پر معنون کیا ہے۔جس نے ۹۶۵ھ، ۱۵۵۷ء سے ۹۸۸ھ، ۱۵۸۷ء تک بیجاپور میں حکومت کی ہے لیکن ان کا اختتام سلطان کی وفات کے تقریباً تین سال بعد ۹۹۱ھ میں ہوا۔

تحفۃ المجاھدین نے یورپ میں خاص شہرت حاصل کی ہے۔اس کے ترجمے انگریزی اور پرتگیزی زبانوں میں ہوگئے۔رولینڈسن (J.Rowland Son) نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا جو مدراس کے قلعہ سینٹ جارج میں فارسی کا مترجم تھا جو اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ سے بہ مقام لندن شائع ہوا ۱۸۳۳ء میں۔ ●●

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک قیمتی ذخیرۂ مخطوطات (جواہر میوزیم) اور اسکے بانی، اٹاوہ کے خان بہادر بشیر الدین کے بارے میں

ڈاکٹر شائستہ خان

کوئی کام نہ چھوٹا ہوتا ہے نہ بڑا؛ کرنے کا طور اسے بڑا یا چھوٹا بنا دیتا ہے۔ بڑا کام، بڑا بھی ہو سکتا ہے چھوٹا بھی۔ ایسے ہی چھوٹا کام بہت بڑا کام ہو سکتا ہے: جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے!

سر سید کا کام ستاون کی لٹی پٹی قوم کی باز آباد کاری (ری ہیبی لی ٹیشن) کا کام تھا۔ اس میدان کا پہلا کام تھا جو انہوں نے علیگڑھ کالج قائم کر کے انجام دیا۔ راستہ کی نشاندہی، رہنمائی سید کا امتیاز تھا، ایک دوسرا امتیاز یہ بھی تھا کہ اپنے ارد گرد جلال الدین محمد اکبر نے جیسے گوناں گوں صفات والے نورتن جمع کر ڈالے تھے ایسا ہی حلقہء اکابر سر سید کو بھی میسر آ گیا۔ تیسرا امتیاز انکا یہ رہا کہ ہم آہنگ مزاج رکھنے والوں نے انکے فکر و عمل سے پورا پورا انسپریشن لے لیا۔ خان بہادر بشیر الدین قافلہ سالار کے ساتھ چلنے والے رفیقوں میں ممتاز ترین شخص تھے جنہوں نے سر سید کے کالج کے کھلنے کے بارہ پندرہ سال کے اندر ہی، سر سید کی مثال سامنے رکھ کے، انگریزی تعلیم اور بورڈنگ کی تربیت کا ایک ماڈل تعلیمی ادارہ، چھوٹے پیمانے پر ہی سہی، اٹاوہ میں قائم کر دیا۔ اور ماڈل کی نوک پلک درست کرنے میں اس حد تک سر سید کے رنگ میں رنگ گئے کہ تربیت کے لئے وہی بورڈنگ ہاؤس والے رہائشی انداز سے لیکر ایک اعلی درجے کی لائبریری اور میوزیم بھی بنا دینے تک سر سید کے قدم بقدم چلتے رہے۔ لائبریری جب مخطوطات کا ذخیرہ ہو تو خود بھی میوزیم کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ علیگڑھ نے لٹن لائبریری کا قیمتی ذخیرہ جمع کر ڈالا تو اٹاوہ نے نقشِ ثانی کے طور سے گریلی میوزیم قائم کر دیا۔ لیکن کیا دلچسپ کھیل کھیلتی ہے قدرت بھی کہ سید کے معنوی شاگرد کا جمع کردہ یہ خوبصورت بیش قیمت ذخیرہ بالآخر کھنچ کے سید والا تبار ہی کی لائبریری کی زینت بن جاتا ہے۔

یہ لائبریری والا میوزیم یا میوزیم والی لائبریری جو اٹاوہ کے خان بہادر نے قائم کی تھی، جس کا افتتاح ۱۹۱۱ء میں ہوا اور جو ۱۹۶۳ء کے آس پاس میں مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں آ گئی، لائبریری کا ذکر تفصیل سے کچھ دیر میں: پہلے کچھ اسکے بانی خان بہادر بشیر الدین کے بارے میں:

☆

ناشکری امت ہے مگر بڑی شکر گزار بھی ہے، ذرا سا اسکے لئے تعلیمی کام کر دیجیے تو کرنے والے کو سر سید ثانی کہنے لگتی ہے۔ یہ لقب پہلی بار امت نے اٹاوہ کے خان بہادر بشیر الدین کو دیا۔ پھر دوسری بار حکیم عبدالحمید کو؛ اور آخری بار سید حامد کو۔ یہ شمالی ہند کی امت تھی۔ جنوب میں متوازی کام کرنے والے جسٹس بشیر سعید، عبدالغفور، ممتاز احمد خاں وغیرہ رہے۔ ان سب نے اگرچہ سر سید کی خدمات کا ایک ہی پہلو اپنے اپنے لئے اختیار کیا یعنی انکا تعلیمی مشن؛ اس دیو قامت شخصیت کی تدوینی خدمات، زبان و ادب کے لئے خدمات، تاریخ و آثار کے لئے گوناگوں کام اور سب سے بڑھ کر 'محمڈن رفارمر' کے کام جن میں مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی رفارم سب ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ ان تک پہنچنے کی کسی میں اتنی سکت کہاں تھی۔ تاہم جو کچھ یہ کر گئے، امتِ مرحوم کی اس گئی گزری حالت میں، کس کو توقع تھی کہ انیس سو استی سے اگلی تین دہائیوں کا نام سید حامد ہوگا جسکا کام ایسا جلیل القدر ہوگا کہ لوگ بار بار اسے سید کی درگاہ کے صاحبِ سجادہ سے اٹھا کر سر سید ثانی کی مسند پر لا بٹھائیں گے۔

بعض اوقات تو سر سید کا نام زبان پر لاتے لاتے نطق زبان کے بوسے لینے لگتا ہے اور کتنے بڑے بڑے کام کر گیا وہ، جو بھی امت میں اچھے کام کرنے کے لئے نکلتا ہے، اسکا سلسلۂ نسب امت فوراً سر سید سے جوڑ دیتی ہے اور محبت سے سر سید ثانی کہنے لگتی ہے۔

بات دور تک جا نکلی، تھی صرف اتنی کہ اٹاوہ کے مردِ مومن کو بھی اسکی خدمات کے لئے امت نے پہلی بار کسی کو سر سید ثانی کہہ کر پکارا۔ اچھا لگا۔ سر سید کے واسطے سے بھی اور خان بہادر بشیر کے واسطے سے بھی۔ لوگوں نے انکے بعد تجویز رکھی کہ انکے اسلامیہ کالج کو انکی یاد میں بشیر کالج کا نام دے دیا جائے لیکن کالج کا جو نام بھی دیتے رہیے، نام تو اسکے بانی بشیر الدین ہی کا زندہ رہے گا۔ انکی ذات سے مخصوص کر کے، نام دیں تو کیا اور نہ دیں تو کیا۔ اتنا شاندار تعلیمی ادارہ قائم کر جانا سر سید ہی کے کسی اعلیٰ درجے کے معتقد کو زیب دیتا ہے۔ شکر گزاری میں سر سید ہی کے ادارے کو اس مرد علم دوست کی قائم کردہ بڑی لائبریری بنام جواہر میوزیم مل گئی۔ دونوں میں یہ ایک اور رشتہ ابد الآباد کے لئے بن گیا۔

تو علیگڑھ کی لائبریری کی کہانی یوں ہے کہ پہلے لٹن لائبریری بنی جس کا آغاز ہوا، سر سید اور انکے بیٹے سید محمود کے قیمتی ذخیرۂ کتب سے۔ پھر اسے ایک مستحکم بنیاد مل گئی گورکھپور کے رئیسِ اعظم سبحان اللہ کی بیش بہا لائبریری کے عطیہ سے، اور رامپور کے نجیب آبادی علم دوست عبدالسلام خان کے کتاب خانے کی علیگڑھ کو منتقلی سے؛ اور آزادی کے بعد کتاب خانہ حبیب گنج کی یونیورسٹی میں آمد سے۔ لائبریری کے تاج میں ایک اور نگینہ کا اضافہ ہوا، اٹاوہ کے جواہر میوزیم کے ذخیرہ مخطوطات کے آنے سے۔ علی گڑھ کو جو عطیات ملے ان میں سے اب تک کا یہ آخری بڑا اور اہم عطیہ جواہر میوزیم کلیکشن ہے۔

☆

اب کچھ خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب کی حیات و خدمات کے بارے میں:

میرٹھ کی پیدائش، بریلی میں ابتدائی تعلیم اور پھر صحافت میں لت پت، یہ رہی خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین کی ابتدائی زمانہ کی سرگزشت، زندگی کا اگلا دور سرسید کی تعلیمی تحریک کی توسیع میں گزرا اور پھر ایسا گزرا کہ انہیں لوگ سرسید ثانی کہہ کر یاد کرتے رہے۔ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے اور جولائی ۱۹۵۶ء میں انتقال ہوا۔ سرسید کے رفیقوں میں بشیر صاحب ہی تھے جنہوں نے انکی تحریک کو اپنا کر، اٹاوہ میں ایک چھوٹے علیگڑھ کالج (Mini Aligarh College) کی بنیاد ڈال دی۔

خان بہادر محمد بشیر الدین اٹاوہ اسلامیہ کالج کے بانی کی حیثیت سے تو مشہور ہیں ہی، لیکن اس سے زیادہ اپنے ہفتہ وار اخبار 'البشیر' کے لئے جانے جاتے ہیں۔ کالج انہوں نے علیگڑھ تحریک کو سامنے رکھ کے شروع کیا۔ یہ سرسید سے ملاقات کے آس پاس کا زمانہ ہے۔ سرسید ہی کے گزٹ کی طرح بشیر الدین صاحب نے بھی اپنا ایک ہفتہ وار البشیر کے نام سے شروع کیا جو ۱۸۹۸ء سے لیکر ۱۹۵۴ء تک یعنی انکی وفات سے دو سال قبل تک جاری رہا۔ اٹاوہ اسلامیہ اسکول / کالج نے علیگڑھ کو اپنا نمونہ بنایا تھا اور البشیر نے سرسید کے علیگڑھ گزٹ کو۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ اس کا اجرا اور سرسید کی وفات دونوں مارچ ۱۸۹۸ء میں واقع ہوئے یعنی سرسید کا گزٹ اپنی روح کے اعتبار سے انکے بعد بھی، ایک دن کے لئے بھی بند نہ ہوا، اور آگے نصف صدی سے زیادہ تک چلتا رہا۔ بشیر صاحب کا اسلامیہ اسکول/ کالج بھی، جو علیگڑھ کالج کے نمونے پر قائم ہوا تھا، انکی تا زندگی ذاتی نگرانی میں اور اسکے بعد انکے لائق جانشینوں کی دیکھ ریکھ میں جاری رہا ہے۔ علیگڑھ کالج کی سب سے بڑی خصوصیت طلبا کے لئے تربیت کے واسطے وہاں کا بورڈنگ سسٹم یا اقامتی زندگی تھی، جسے پوری طرح اٹاوہ نے بھی اپنا لیا۔ اضافہ یہ کیا کہ غریب طلبا کے لئے، ایک الگ ہاسٹل مختص کر دیا۔

اٹاوہ کالج یوں تو دسمبر ۱۸۸۸ء میں شروع کر دیا گیا تھا لیکن باقاعدگی کے ساتھ دسمبر ۱۸۸۹ء میں شروع ہوا، ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول کی شروعات ہوئی۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے سالِ آغاز ہی میں بشیر صاحب نے اپنے ادارے کی دیکھ ریکھ کے لئے ایک ٹرسٹ بنا دیا۔ جس کی نگرانی میں ۱۹۴۴ء میں یہ اسکول اسلامیہ انٹر کالج بن گیا۔ کانپور کے حافظ محمد صدیق سے ساڑھے تیس ہزار عطیہ کی رقم بشرط موصول ہونے پر اسکا نام حافظ صاحب کے نام پر رکھ دیا گیا۔ البتہ ادارے کے دستور کی اولیں شق ہی میں یہ بات صاف کر دی گئی کہ اسے "مولوی بشیر الدین نے ۔۔۔ قائم کیا تھا"۔ بشیر صاحب کے ادارے نے یوپی پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین نفیس الحسن صاحب (۱۹۰۰۔۱۹۷۸ء) اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ممتاز طالب علم پیدا کئے۔ اور الطاف حسین صاحب جیسے ہیڈ ماسٹر جن کی شفقت اور عظمت کو ذاکر صاحب آخر وقت تک نہ بھلا سکے۔ ذاکر صاحب (پ ۱۸۹۷ء) ۱۹۰۷ء میں یہاں پانچویں کلاس میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں جب وہ آٹھویں کلاس میں پڑھتے تھے، انہوں نے اپنا پہلا مضمون 'طالب علم کی زندگی' یہیں لکھا۔ حقیقت میں علیگڑھ سے بھی پہلے، ذاکر صاحب

کی ذہنی نشوونما میں بشیر صاحب اور ان کا ادارہ اپنا پورا رول ادا کر چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں انہیں جب اپنی پہلی مادرِ درس گاہ کی یاد آئی تو بڑے پیار سے لکھا تھا:

'۳۴ سال اس مدرسے کو چھوڑے ہوئے ہو گئے، جب کبھی اس زمانے کی یاد آتی ہے تو کوئی اچھی ہی یاد آتی ہے۔ ہاسٹل اس وقت کرایہ کے مکانوں میں تھے اور تعلیمی سامان بھی کچھ یوں ہی سا تھا۔ مدرسے کی عمارت بھی میرے زمانے میں برابر بنتی ہی رہی۔ مجھے اسکی ایک ایک اینٹ یاد ہے۔ اس ۳۴ سال میں بہتیرے مدرسے دیکھے، بہت سے مدرسوں کے انتظام سے واسطہ رہا، خود بھی مدرسہ چلاتا ہوں لیکن کبھی جھوٹوں بھی یہ خیال میرے دل میں نہ آیا کہ کاش میں نے اپنے مدرسے کی جگہ کسی اور مدرسے میں تعلیم پائی ہوتی''۔

ڈاکٹر مجیب اشرف نے اپنی قابلِ قدر کتاب 'حیات البشیر' میں اوپر کی عبارت نقل کی ہے۔

ذاکر صاحب جب علیگڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو ۱۹۵۰ء کے سالانہ کانووکیشن میں بشیر صاحب کو ڈاکٹر آف لا کی اعزازی ڈگری دی گئی۔

۱۹۱۰ء میں بشیر صاحب کی قائم کردہ **لائبریری** جسے انہوں نے مخطوطات کے بیش قیمت ذخیرہ کے سبب میوزیم کا نام دیا تھا، ۱۹۱۱ء میں اٹاوہ کے پہلے ضلع کلکٹر گریسی اور پھر ۱۹۵۵ء میں عبدالمجید خواجہ کے مشورہ پر جواہر لعل کے نام سے موسوم کیا تھا۔

ہمارے لئے تو یہ اٹاوہ کے اسلامیہ کالج کے بانی، سرسیدِ ثانی کی قائم کردہ وراثت بہر طور بشیر الدین (اٹاوہ) لائبریری ہی رہے گی۔ ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔اے۔علیگ، کتاب خانہ کے کسٹوڈین، نے مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست اٹاوہ ہی سے ۱۹۵۹ء میں مرتب کر کے شایع کی۔ اس فہرست کا پیمانہ محدود تھا یعنی صرف فارسی زبان تک محدود تھا اور وہ بھی ۱۸۰۰ میں سے صرف ۱۸۲ نسخوں کے بیان پر مشتمل۔ نام رکھا گیا تھا ''تذکرۂ جواہر زواہر (جلد اول)''۔ اس میں یہ ذکر کہیں نہیں آیا کہ یہ صرف فارسی زبان کے چند مخطوطات ہیں۔ جبکہ اس اٹاوہ ذخیرہ میں تقریباً ۵۰۰ عربی اور تقریباً ۱۱۰۰ فارسی اور قریباً ڈیڑھ سو اردو زبانوں کے مخطوطات بھی محفوظ ہیں۔ اب خدا کا شکر ہے کہ پورے ذخیرہ کی فہرست آپکے ملاحظہ میں لائی جارہی ہے۔ فی الحال یہ بطور ہینڈ لسٹ یا مختصر یک سطری اندراج ہی پر اکتفا کیا جارہا ہے، توضیحی کیٹلاگ اطمنان سے پیش کیا جائے گا۔ ان مخطوطات کا لائبریری کے وصولیابی بنیادی رجسٹر میں accession ۱۹۶۳ء میں ہوا۔

بقول ڈاکٹر مجیب اشرف صاحب حیات البشیر ''بشیر صاحب سرسید کی تحریک کے مشن کے پرزور حامی تھے اور علیگڑھ سے جو صدا بلند ہوتی تھی اس پر لبیک کہنے کے لئے سب سے پہلے اٹاوہ ہی سے آواز آتی تھی۔ اس طرح علیگڑھ کالج کو اٹاوہ نے مضبوط کیا اور علیگڑھ کالج نے اٹاوہ تحریک کو''۔

۱۹۱۰ء میں میوزیم کا آغاز ہو، ۱۹۱۲ء میں گریسی کلکٹر اٹاوہ نے اسکا افتتاح کیا، ۱۹۵۵ میں، یہ جواہر میوزیم ہوگیا۔ جواہر میوزیم کلیکشن ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی خواہش کے مطابق علیگڑھ مسلم یونیورسٹی لایا گیا اور تب سے یہ مولانا آزاد لائبریری کی زینت ہے۔

اب کچھ جواہر میوزیم کے نادر مخطوطات کا ذکر:

جواہر میوزیم کلیکشن جو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں انیس سو ساٹھ کی دہائی میں آیا، اور جس کے بانی اٹاوہ کے خان بہادر بشیر الدین سرسید کے ہمعصر و بڑے مداح تھے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے یونیورسٹی لائبریری کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جس کے منتخب نادر مخطوطات کا مختصر تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

پچھلے دو ڈھائی سو سال کو چھوڑ کے جو مخطوطات کی زبان میں کل پرسوں کہے جا سکتے ہیں، ہم نے اورنگ زیب کی وفات تک ایک حد مقرر کر کے، اس سے پہلے کے چار پانچ سو سال کے اندر کتابت شدہ مخطوطات کو نادر قرار دیکر ایک مختصر انتخاب تیار کیا ہے۔ تاریخ کتابت کی اس مذکورہ اہمیت رکھنے والے ان مخطوطات میں ہم نے مزید اضافہ کیا ہے ایسے مخطوطات کا جنکے **موضوعات یا مصنفین کسی اہمیت کے مالک ہوں، یا پھر اس پر اہم اشخاص کی کوئی تحریر یا مہریں ہوں، یا خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو، مصنف کا قریب العہد سنہ کتابت ہو یا مصور نسخہ ہو۔** تو ملاحظہ ہوں منتخب نوادرات :

- **معرفۃ القلوب یا عشقیہ** مصنفہ قاضی حمید الدین ناگوری، سال تصنیف تقریباً ۶۷۸ھ، مکتوبہ ۱۲۷۱ھ بخط نستعلیق۔ قدیم مکتوبہ نسخہ ہے۔
- **عنایاتِ الٰہیہ**، سال تصنیف ۱۱۶۲ھ، مسائل تصوف پر اہم رسالہ مصنف نے اپنے دادا شاہ عنایت اللہ نقشبندی بالاپوری کی سوانح بھی لکھی ہے۔ شاہ صاحب کا وصال اورنگزیب کے انتقال سے ایک سال پہلے ۱۱۱۷ھ میں ہوا۔
- **درجاتِ خمس**: سالِ تصنیف ۱۰۲۷ھ، مصنفہ پیر محمد لکھنوی، تصوف و سلوک پر اہم نسخہ۔
- **خلاصۃ الاخبار فی بیان احوال الاخبار**: سال تصنیف ۹۰۵ھ مکتوبہ ۹۲۰ھ۔ کتاب میں مستند حوالجات کی بہت ہی اہم تاریخ اسلام ہے جو خلق آدم سے شروع کر کے مصنف نے اپنے ولی نعمت امیر نظام الدین علی شیر نوائی والی حیرات پر ختم کی ہے۔ **اس نسخے کی کتابت مصنف کی حیات میں ہوئی۔ اور مصنف نے اس پر نظر ثانی بھی کی۔** جگہ جگہ اصطلاحات اس کی شاہد ہیں۔ (ج ف ۳۷۲)
- **نفحات الانس**: سال تصنیف ۸۸۳ھ، مکتوبہ ۹۱۱ھ، خط نستعلیق، مطلا و مذہب، سرورق سلطان محمد صفوی کے کتب خانے کی سنہری مہر جس میں سلطان اور کتب خانے شاہی کے تحویلدار محمد اسماعیل ترکمان کے نام ہیں اور ۹۴۵ھ لکھا

ہے۔ نسخہ کے آخری ورق کی پشت پر شہزادی جہاں آرا بنت شہنشاہ شاہ جہاں کے قلم کی ایک مختصر عبارت ہے۔ جس میں شہزادی نے اپنا نام لکھتے ہوئے ۱۰۵۰ھ لکھا ہے۔ اس سے قدیم مکتوبہ نسخہ شاید ہی کسی کتب خانے میں ہو۔ (ج ف ۱۱۱)

● **تذکرۂ بے نظیر**: مصنفہ ۱۱۷۲ھ گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ جن میں بیشتر مصنف کے معاصرین ہیں۔

● تصنیف الملوک مرتبہ ملوک چند مرلی دھر: سال تصنیف ۱۰۹۸ھ جس میں بادشاہوں کے فرامین واسناد و عرضداشتیں وغیرہ غالباً مرتب کے ہاتھ کا ہی نسخہ ہے۔

● **دستور السیاق**: یہ حساب و کتاب و مالگزاری کے فن میں مشہور ہندی کتاب **مدھ پرکاش کا فارسی ترجمہ ہے**۔ جو مصنف لالہ اودے لال کے قلم کا رہین منت ہے۔ جوانھوں نے ۱۲۳۶ھ میں لکھا۔

● صراح از ابوالفضل محمد ابن جمال القرشی، **مکتوبہ ۸۸۰ھ**، (جواہر فارسیہ ۱۴۳)

● مخزن اسرار از نظامی گنجوی، **مکتوبہ ۶۱۱ھ** (ج ف ۱/۱۸۲)

● انشائے دستور الٰہی: مرتبہ میر عبد الجلیل بلگرامی، یہ سید ضیاء اللہ بلگرامی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو ۱۱۱۷ھ میں مرتب کیا گیا۔

● ترجیعات عراقی: **مکتوبہ ۸۸۰ھ**، کاتب اظہر یاقوت، بخط نستعلیق خفی، نہایت خوبصورت، اول تا آخر مطلا و مذہب۔ پہلے صفحے پر شہنشاہ جہانگیر کے قلم کی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

"اللہ اکبر، پنجم آذر سنہ احلوس داخل کتب خانہ ایں نیاز مند درگاہ الٰہی شد۔ در دار الخلافہ آگرہ۔ حررہ جہانگیر"

● کتاب اسولہ واجوبہ رشیدی مصنفہ شیخ رشید الدین فضل اللہ المشہور بہ طبیب ہمدانی۔ سال تصنیف ۷۱۰ھ، سال کتابت ۹۴۴ھ بخط نسخ خراسانی خفی۔ مصنف سلطان محمد الجائتو خدابندہ والی خراسان کے مشہور وزیر اعظم تھے۔ اپنی جامعیت کے اعتبار سے یہ کتاب مجمع العلوم یا مخزن الفنون ہے۔ (ج ف ۸۳)

● چہار گلشن: **از چتر من کایستھ سکینہ، تاریخ ہند پر اہم نسخہ** (ج ف ۸۱)

● مثنوی سکندر نامہ، (**مصور نسخہ**)، برحاشیہ گلستان و بوستان۔ (ج ف ۱۷۴)

● مثنوی مولانا روم مرتبہ **عبد اللطیف** سمرقندی، کتابت: **۱۰۳۵ھ در حیات مرتب**، تدوین کے لئے اہم نسخہ (ج ف ۱۶۹)

● منتخب لب لباب معنوی **ایک شاہی نسخہ**، مرتبہ **واعظ حسین کاشفی** (ج ف ۷۸۷)

● فصل الخطاب از خواجہ محمد پارسا نقشبندی **مکتوبہ ۹۷۹ھ** بہ عہد اکبر؛ **تصوف پر اہم کتاب** (ج ف ۴۴)

● حکایات بختیار کا کی از معین **مکتوبہ ۵۶۳ھ**، تصوف و اخلاقیات پر۔ (ج ف ۵۶۱)

● الٰہیات مذہب ہنود: موسومہ بہ اظہار الحق، **ہندومت پر اہم تصنیف**۔ (ج ف ۵۷)

- مفرح القلوب: ہتوپدیش کا فارسی ترجمہ، تدوین کے لیے اہم نسخہ (ج ف ۵۵-۵۵۴)
- تفسیر حسینی: مصنفہ کمال الدین حسین واعظ کاشفی مرتبہ ۸۹۷ھ ومکتوبہ ۸۹۹ھ۔ (ج ف ۸)

عربی کے چند نادر مخطوطات:

- معالم التنزیل از محمد حسین بن مسعود البغوی الشافعی مکتوبہ ۶۰۰ھ، (جواہر عربیہ ۶۷)
- تفسیر کشاف از علامہ جاراللہ زمخشری مکتوبہ ۷۰۹ھ از محمد بن محمد الخوارزمی (جواہر عربیہ ۶۸)
- صحیح بخاری از اسماعیل بخاری مکتوبہ ۱۰۶۹ھ بعہد شاہ جہاں، شاہی کتب خانے کے تحویلدار عبداللہ چشتی حسینی کے دستخط سنہ ۲۶ جلوس درج ہے مع دیگر مہروں کے (جواہر عربیہ ۱۷)
- شمائل ترمذی: مکتوبہ ۸۵۸ھ دیدہ زیب، سرورق اور جداول مطلا و مذہب، یہ نسخہ افراسیاب خاں رومی نے شہنشاہ اورنگ زیب کو پیش کیا۔ (ج ع ۷۶)
- جامع المعجزات از شیخ محمد واعظ الہادی مکتوبہ ۷۱۰ھ (ج ع ۸۴)
- الخلافیات فی مذاہب ثلاثہ از ابوحفص مصحفی مکتوبہ ۷۱۹ھ (جواہر عربیہ ۲۰۵)
- نہج البلاغہ: مکتوبہ ۱۰۲۰ھ، شاہی لوگوں کے تحویل میں رہی۔ جن کی مہریں ملتی ہیں۔ (جواہر عربیہ ۲۲۴)
- شفا از قاضی عیاض مزین و مذہب نسخہ (جواہر عربیہ ۲۵۴)
- شرح کافیہ مؤلفہ شیخ رضی الدین محمد بن الحسن استرآبادی مرتبہ ۶۸۳ھ، مکتوبہ ۶۸۶ھ، بخط مصنف (ج ع ۲۷)

قرآن وحدیث کے کچھ نادر مخطوطات:

- قرآن بخط بہار مکتوبہ ۴۸۰ھ (جواہر عربیہ ۱)، قرآن مکتوبہ ۵۵۳ھ (جواہر عربیہ ۲۲)، قرآن مکتوبہ ۶۵۶ھ (جواہر عربیہ ۳۱)، قرآن مکتوبہ عبدالباقی حداد (جواہر عربیہ ۶۳)، قرآن مکتوبہ ۱۰۱ھ بخط ثلث؛ بین السطور میں فارسی ترجمہ اور حواشی پر تفسیر فارسی۔
- مشکوٰۃ شریف: مکتوبہ ۹۹۹ھ (دو جلد)، اول تا آخر مطلا و مذہب، حاشیہ پر ملا علی قاری کی کتاب المناسک بھی لکھی ہوئی ہے (ج ع ۷۸)
- بخاری شریف: مکمل مطلا و مذہب، یہ نسخہ بھی اورنگ زیب کے مطالعہ میں رہا۔ تحویلدار نے ۲۶ھ جلوس عالمگیری لکھ کر مطالعۂ شاہی کی طرف عرض دیدہ شد کا اشارہ کیا ہے (ج ع ۱۴۷، ۱۴۰)

● ● ●

اے کاش تیرے دل میں اتر جائے میری بات!

الحاج اخلاص احمد شروانی

شکر ہے اس رب کا جس نے ہمیں انسان بنا کر بھیجا اور ایک خاص مدت کے لیے ہمیں زندگی بخشی اور اس زندگی کو محترم ومکرم ہونے کا درجہ بھی عطا کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتوں کے ساتھ زمین پر اتارا، اور ان نعمتوں میں ایک نعمت اولاد بھی ہے۔ لہٰذا ہم پر بھی ایک خاص ذمہ داری عائد کر دی گئی ہے کہ ہم اپنی اولاد کے حق میں بہتر سوچیں، بہتر کریں تاکہ انکا مستقبل تابناک بنے۔ اس کے لیے ہمیں چاہیے کہ اولاد کی اچھی دیکھ بھال، اچھی پرورش، اعلیٰ تعلیم وتربیت کا بندوبست کریں، تاکہ وہ ایک اچھے ہونہار انسان بن جائیں اور ان کی زندگی باسلیقہ اور باشعور ہو، ان کے ساتھ بچپن میں برتی گئی ذرا سی لاپرواہی انتہائی مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ ان کے مستقبل کے لیے پوری طرح سے خدشات لاحق ہو سکتے ہیں۔ وہ خراب صحبت میں شامل ہو سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں پورے خاندان کی زندگی ضیق میں پڑ جائے گی۔ اُن نونہالوں کے اوپر جو سخت نگاہ رکھنی ہے وہ عمر ہے ۱۳ سے ۱۹ سال تک، جب تک وہ سنِ بلوغ تک ساتھ خیریت کے نہ پہنچ جائیں۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ معاملات دونوں کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ فطرت کا دستور دونوں پر یکساں عائد ہوتا ہے والدین کی دانشمندی اس میں ہے کہ اس عمر کے بعد سے وہ بچے خود بہ خود سمجھدار ہو جاتے ہیں اپنا بھلا برا سمجھنے کی صلاحیت آجاتی ہے۔ وہ فطرت کے دستور سے واقف کار بن جاتے ہیں۔ سماجی، معاشرتی اور اسلامی قانون میں بھی ان کی رسائی ہونے لگتی ہے۔ اگر ابتدائی تعلیم کے اندر اسلامی تعلیم پر خاص توجہ دلائی گئی ہے تو وہ بچہ کہیں پر شکست نہیں کھا سکتا کیوں کہ اسلامی تعلیم کی باریکیوں کو اس عمر میں آکر اچھی طرح سمجھ لیتا ہے تو بہتر ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی اولاد پر شروع میں دھیان نہیں دیا یا کوئی مجبوری رہی ہو، الگ بات ہے ورنہ بغیر تعلیم وتربیت واصلاح کے بچے عام طور سے راستے سے بھٹکنے لگتے ہیں ان کے افعال شعوری طور پر وہ نہیں ہوتے ہیں جو ایک تربیت یافتہ بچے کے ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے بچے اللہ تعالیٰ کا نایاب تحفہ ہیں ان کو تعلیم وتربیت سے کیوں محروم رکھا جائے تاکہ ان کی زندگی بے نور وبے کیف نہ بن جائے۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ کوئی اچھی عمارت بغیر نقشے وبغیر سپرویزن کے نہیں بنا کرتی ہے چاہے معمار کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو۔ اچھے کھلاڑی تبھی نکل کر آتے ہیں جب ان کو اچھا کوچ اچھا فیلڈ اور اچھا ماحول

ملے۔ اگر کسی کو باغبانی کا شوق ہے تو اچھے باغ باں کو تلاش کرنا ہوگا۔ تبھی آپ رنگ برنگ کے خوشبودار پھولوں کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ورنہ پھول تو کاغذ اور پلاسٹک کے بھی بنتے ہیں مگر ان میں وہ بات کہاں؟

الحمدللہ اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کو حد نظر بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے پاس اللہ کا دیا ہوا دستور حیات موجود ہے۔ جس میں انسان کی زندگی کو بڑے قریب سے سمجھایا گیا ہے اور انسان کی زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کرتا ہے اور ایک کامیاب مقام تک پہنچا دیتا ہے جس میں انسان کی کامیابی ہے اور یہ اللہ کی طرف سے نازل کیا ہوا وہ دستور ہے جس کی مثال نہ کسی اخلاقی معلم کی کتاب میں ملے گی نہ کسی فلسفی کے فلسفہ میں پائیں گے۔ یہ ایک مکمل انسانی حیات کا انسائیکلو پیڈیا ہے اور اس پر جو گائڈ مقرر کیے گئے ہیں وہ ہمارے پیارے نبی ﷺ ہیں کہ جو بات انسان کی سمجھ میں نہیں آئی اس کا خلاصہ آپ ﷺ نے کیا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ ہماری تعلیم وتربیت کا دارو مدار قرآن کریم پر ہے۔ اس لیے ہم کو اپنے نونہالوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت کو قرآن کی روشنی میں کرانی چاہیے۔ اور سنت کی چادر میں لپیٹ کر خوشنما زندگی گذارنے کے واسطے مواقع فراہم کرائیں۔ کیوں کہ آفاقی نظام حیات لازوال ہے اور مستحکم بھی ہے۔ اس حیات فطری میں اتحاد بھی ہے اور سلامتی بھی ہے، اسلامی اخوت بھی ہے تو سیاسی قوت بھی ہے، یہاں تک کہ اس کے اندر اللہ کی نصرت شامل ہے۔ لہٰذا مندرجہ ذیل کچھ حوالے قرآن کریم سے پیش کیے جارہے ہیں تا کہ ہم سب کی فہم کو تقویت ہو جائے:

۱- سورہ فرقان (آیت ۶۳) ''(رحمٰن کے خاص) بندے وہی ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جہلا (ان سے) جہالت کی بات کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کرتے ہیں''۔ (نوٹ: اللہ کی منشا یہ ہے کہ ہم اس طرح کی زندگی بسر کریں جس میں عافیت ہو اور عاجزی اور انکساری بھی ہو)۔

۲- سورہ البقرہ (آیت ۲۶۹) ''دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو سب کچھ مل گیا۔ اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی اور نصیحت وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو عقل والے ہیں''۔

۳- سورۃ القمان (آیت ۱۲) ''ہم نے لقمان کو دانشمندی عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو اور جو شخص اللہ کا شکر ادا کرے گا وہ اپنے ذاتی نفع کے لیے شکر ادا کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بے نیاز خوبیوں والا ہے''۔

۴- سورۃ الاسراء (آیت ۳۷) ''اور زمین پر اتراتا ہوا مت چل (کیونکہ) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور (نہ بدن کو تان کر) پہاڑوں کی لمبائی تک پہنچ سکتا ہے''۔

۵- سورۃ طٰہٰ (آیت ۴۴) ''دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے۔ پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (ترغیب) نصیحت قبول کرے، یا عذاب الٰہی سے ڈر جائے''۔ (نوٹ: اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت موسیٰ وان کے بھائی ہارونؑ کو فرعون کے پاس بھیجتا ہے کہ وہ فرعون کے دربار میں جا کر

عاجزی وانکساری کے ساتھ داخل ہو کر اس کو سمجھائیں (فرعون) کو اس لیے عاجزی وانکساری کا سبق اللہ نے نبیوں کو سکھایا ہے، جو اللہ کی رحمت کا پسندیدہ منشا ہے، لہٰذا عقلمندوں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے بہتر مثال قرآن میں دی گئی ہے اگر ہم آج بھی اس مثال کو اپنے میں اتار لیں تو ہماری زندگی بہتر اور عافیت کے ساتھ گزرے گی)۔

۶- سورۃ لقمان (آیت ۱۴) ''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے کہ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اپنا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنی ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر۔ میری ہی طرف لوٹ آنا ہے''۔

۷- سورۃ لقمان (آیت ۱۶) ''بیٹا کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر ہو پھر وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا وہ آسمان میں ہو تب بھی اللہ تعالیٰ حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا باریک بین باخبر ہے''۔

۸- سورہ الزمر (آیت ۱۸) ''سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجیے جو اس کلام الٰہی کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں۔ یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں''۔

۹- سورۃ لقمان (آیت ۱۷) ''بیٹا نماز پڑھا کر اور اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور برے کاموں سے منع کیا کر۔ تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے''۔

۱۰- سورۃ لقمان (آیت ۱۸) ''اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور زمین پر اتراتا ہوا مت چل، بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے کو، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا''۔

۱۱- سورۃ لقمان (آیت ۱۹) ''اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر بے شک آوازوں میں سب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔ (نوٹ: لقمان اور حضرت موسیٰؑ کے واقعات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ واقعات انسان کے لیے نہایت سبق آموز ہیں تاکہ ہم بھی اپنے بچوں کی زندگیاں اسی پیرائے پر اتاریں اور من جملہ ذیل میں نکات جو سامنے لائے گئے ہیں وہ یہ کہ:

۱- والدین کے ساتھ حسن سلوک کریں اور ان کے اکرام میں کسی طرح کی ڈھیل یا لاپرواہی نہ برتی جائے۔

۲- وہ یہ کہ اللہ سے خوف کھاتے رہیں کیوں کہ وہ بہت باریک بین اور ہماری طرف سے باخبر رہتا ہے۔

۳- دوسروں سے اچھے تعلقات بنانے کی ضرورت ہے اور اچھے اخلاق کے پابند ہونے کی بھی ضرورت ہے۔

۴- شیریں زبانی اور خوش کلامی سے دوسرے کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔

۵- یہ کہ برائی سے خود بھی دور رہو اور دوسروں کو بھی دور رہنے کے لیے مشورہ دیتے رہیں۔ یہی اللہ اور اس کے رسول کا بہترین فرمان ہے۔ اس میں ہم سب کی بھلائی اور کامیابی ہے۔ لہٰذا اپنی اولاد کو اسلامی تعلیم سے روشناس کرائیں یہی والدین کی ذمہ داری ہے اللہ ہم سب کی مدد کرے۔ آمین

●●●

ماضی کے دریچوں سے

اہل کتاب-۳

مولانا مناظر احسن گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانی، جنہیں گیلان سے کوئی بھی واسطہ نہیں، کہ گیلان تو پٹنہ کے مضافات کی ایک مردم خیز بستی ہے، اور اس بستی کا نام گیلانی ہے، یعنی اخیر میں یائے نسبتی نہیں جوج میں بدل کے جیلانی ہوجاتی ہے اور اصل گ میں عہد اسلامی کے مشہور شہر گیلان کی گویا یائے نسبتی بن جاتی ہے، اب ایک ہندستانی فاضل کبیر نے اپنی بستی کو اپنے نام کا جزو بنا کے ہندستان میں علوم اسلامیہ کے ایک بڑے عالم سے نسبت پا کے قدیم مشاہیر گیلان کے برابر کا درجہ حاصل کر کے ہندستان کی عظمت کا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔

مرحوم کی متعدد اعلیٰ درجے کی کتابوں سے علما استفادہ کرتے رہے ہیں، اور ایک کتاب تو ہند اسلامی کی اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا بن گئی ہے، جس کا نام ہے ''ہندستان میں اسلام کا نظام تعلیم و تربیت''۔ یہ دو جلدوں میں ان کا معرکہ آرا کارنامہ ہے، دوسری کتابوں میں ''مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ'' اور ''سوانح قاسمی'' قابل ذکر ہیں۔

مولانا گیلانی کی عمر کا بڑا حصہ حیدر آباد میں گذرا جہاں وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے صدر تھے، دہلی کے مشہور علمی ادارہ ندوۃ المصنفین کے سنچالک مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ہمارے مولانا گیلانی کے بڑے قدر دانوں میں تھے۔ اور دلچسپ بات ہے کہ مولانا گیلانی معارف کے حلقوں میں بھی، اتنے ہی مقبول تھے جتنے برہان کے حلقوں میں۔ شاید اس خصوصیت میں وہ لاشریک ہیں۔

مولانا گیلانی کی ایک قابل قدر تحریر، موضوع زیر بحث پر آزادی کے کچھ ہی دن بعد معارف میں چھپی تھی، جواب کم ہی لوگوں کو یاد ہوگی، ایسا لگتا ہے کہ اس موضوع پر ہندومت کی بنیادی کتابوں کے مزید مطالعات کرنے کا ارادہ تھا، لیکن محدود یہ صرف مہابھارت تک ہی رہ گیا۔ اب جو بھی ہم تک ورثہ میں پہنچ گیا غنیمت ہے۔

جو مبحث ہم نے چھیڑا ہے اس پر مولانا گیلانی کی مذکورہ تحریر کا ضروری حصہ ملاحظہ میں لایا جارہا ہے۔ بیس پچیس برس پہلے سر سید ہال کے عثمانیہ ہاسٹل میں رہائش پذیر کسی ریسرچ اسکالر نے مولانا گیلانی پر بہت اچھی ریسرچ کا ڈول ڈالا تھا، خدا بخش لائبریری سے ان کی کچھ خط و کتابت بھی ہوئی تھی، قرینہ سے لگتا تھا کہ بہت اچھا کام کرنے والے ہیں، پھر معلوم نہیں، وہ منصوبہ اور وہ ریسرچ کرنے والے صاحب کہاں تک پہنچے۔

یہ امر کہ غیر مسلم اہل ہند کا واقعی دین، (نہ کہ شہرستانی کی طرح سنا سنایا)، کس حد تک اسلام سے قریب ہے... (اور اسی لیے ہمارے بزرگ انھیں اہل کتاب قرار دیتے رہے ہیں)، تفصیلی تحقیق وجستجو کا طلب گار ہے۔ بدھ دھرم، جین دھرم اور سناتن دھرم یا ہندومت یہاں کے وہ خاص مذہب ہیں جو اسلام سے پہلے موجود تھے۔ بدھ مت اور جین مت کے بارے میں اس وقت کوئی بحث مطلوب نہیں ہے لیکن ہندوؤں کے سلسلے میں ہمارے عہد کے ایک بہت بڑے عالم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے جو کچھ لکھا ہے ''اسلام اور ہندومت کی بعض مشترک تعلیمات'' (معارف، اپریل ۱۹۵۲ء) اس قابل ہے کہ جب بھی یہ مسئلہ چھڑے وہ جستہ جستہ پیش کیا جاوے۔ مولانا گیلانی کی تحریر سے متعلقہ حصے ملاحظہ ہوں۔ (ب ع ر)

دنیا جانتی ہے کہ برہمنوں کے دین کی بنیادی کتاب وید کے متعلق عام عقیدہ اس کتاب کے ماننے والوں کا یہی ہے کہ خالق کائنات کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ دور کیوں جایئے مہابھارت جو عام طور پر ہر ہندو کے گھر میں اب بھی پڑھی جاتی ہے اسی میں بہ کثرت اس قسم کی باتیں آپ کو مل سکتی ہیں، مثلاً: ''پرمیشر (خدا) کی سانس سے وید اُتپن (پیدا)

ہوئے"۔(اویوگ پرب ادھیائے)

یا اس سے بھی زیادہ الفاظ یہ ہیں کہ "پتشری (عبادت گزار) لوگ بید بچن (وید کے الفاظ، کو بھگوان کا واک (کلام) جان کر اس پر ڈرہ بدھی (استقامت اختیار کرتے) رہے ہیں۔" (شانتی پرب حصہ سوم ۱۷۹ ادھیائے)

افسوس یہ ہے کہ ہندستان کے قدیم مذاہب وادیان کے وثائق اور یادداشتوں کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا ہے، ورنہ ان ہی کتابوں میں نہیں جن کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا عام رواج اس ملک میں باقی نہیں رہا ہے اور اسی وجہ سے ان کے مطالب اور معانی کی صحیح یافت دشوار ہوگئی ہے، بلکہ مہابھارت جیسی عام کتاب جس کا اب بھی تقریباً ویدک دھرم کے ماننے والوں کے گھر گھر میں پاٹھ ہوتا ہے، اور ہر کہہ اور مہہ، چھوٹے بڑے کی رسائی خود اس کتاب تک اور اس کے مضامین تک آسان ہے، اسی میں ایسی حیرت انگیز چیزیں مل جاتی ہیں کہ آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ دیا گیا ہے اس کا بڑا حصہ اب بھی ہندستان کے باشندوں کے اگلے بزرگوں کی کتابوں میں موجود ہے، قرآنی تعلیمات کا بنیادی مسئلہ اور جوہری روح جیسا کہ سب جانتے ہیں توحید ہے، یعنی بجائے مخلوقات کے، عالم کے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہ ہی کی عبادت۔ یہی قرآن کا محوری پیغام ہے، اسی محور پر اس کے سارے مطالبات گردش کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو قرآن میں ہے۔ اب مہابھارت کے بن پرب کا اکھتر واں ادھیائے کا ترجمہ پڑھئے بھیم سین جو مہابھارت کی جنگ کے گویا رستم تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ ایک دفعہ ہنومان جی نے بھیم سین کو اپنے درشن دیئے تو اس وقت قدیم ہند کے سناتن دھرم کی خصوصیت کو بتاتے ہوئے ہنومان جی نے جیسا کہ اسی کتاب میں ہے یہ کہا ہے کہ "کرت جگ جس کو سب جگ کہتے ہیں، اس میں سناتن دھرم جاری تھا۔"

سناتن دھرم جب اس ملک میں جاری تھا تو اس کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہنومان جی کے مطابق کیا تھی، سنیئے ہنومان جی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ: اس جگ میں دھرم کا ناش نہیں ہوتا تھا، دیوتا و دوان، گندھرب، کنھر، جکشن، منش لے سب ایک پرشوتم بھگوان کی پوجا کرتے تھے"۔ (بن پرب ۱۷۱ ادھیائے)۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ اس ملک کے آباد کاروں کے آباء اولین (اگلے آباو اجداد) کے دین کا جوہری عنصر توحید ہی تھا اور خالق عالم جل مجدہ ہی کی ذات پاک اس ملک کا واحد معبود، ہنونان جی کے زمانہ میں تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب ملک پر رام چندر جی حکومت کرتے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہا، بھیشم پتامہ جن کا ذکر علم وعرفان، حسن کردار وعمل کے مثالی وجود کی حیثیت سے اس زرمیہ داستان مہابھارت میں کیا گیا ہے، جب زخمی ہو کر بھیشم پتامہ پتروں کے سیج پر لٹادیئے گئے تھے اور ان کی مزاج پرسی کے لیے آخر میں خود شری کرشن جی بھی ان کے بالیں پر پہنچے، تو لکھا ہے کہ: "بھیشم جی کو انن بھگت جان کر ترلوکی درشن۔" سری کرشن جی نے سرفراز کیا، تینوں عالم (لوک) کا مشاہدہ ان کو کرا دیا، مذکورہ بالا فقرے میں "انن بھگت" کا جو لفظ ہے اس کا مطلب اسی کتاب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "جو کیول (= صرف) نارائن (خالق عالم) کی اوپاسنا (عبادت) کرتا ہو۔" (مہابھارت شانتی پرب ۲۳، ادھیائے)

اس سے معلوم ہوا کہ مہابھارت کی جنگ اس ملک میں جب لڑی گئی تھی اس وقت تک دینی زندگی کی روح یہی ''انن بھگت'' ہونا سمجھی جاتی تھی، اور یہ تو خیر پھر بھی اجمالی بات ہوئی، مہابھارت کی جنگ میں فاتح اعظم ہونے کی حیثیت راجہ جدھشٹر کو حاصل ہوئی تھی، ان ہی کو ان الفاظ کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے یعنی'' ہے مہا بھاگ (بڑے خوش قسمت) راجہ جدھشٹر'' منجملہ اور باتوں کے یہ اپدیش بھی ان کو دیا گیا تھا، جس میں خالق عالم کو ان الفاظ میں روشناس کراتے ہوئے کہ ''وہی نارائن سرشٹی (عالم) کو اتپن (پیدا) کرتا ہے اور پھر اپنے میں لے لیتا ہے، (یعنی ہر چیز اسی کی طرف واپس ہو اتی ہے (الیہ راجعون) وہی سب دیوتاؤں، رشیوں، دانوؤں، گندھریوں، منشوں کا پالن پوشن کرنے والا ہے)۔'' آخر میں راجہ جدھشٹر کو حکم دیا گیا تھا کہ ''اسی نرگن دیوتا کا پوجن کرو۔'' گویا: ذالکم اللہ ربکم فاعبدوہ (یہی اللہ ہے تمہارا پروردگار، پس اسی کو پوجتے رہو) کی قرآنی آیات کا جو حاصل ہے، اسی کی تعلیم راجہ جدھشٹر کو دی گئی تھی اور مہابھارت کا یہ نرگن دیوتا جس کی پوجا کا مطالبہ راجا جدھشٹر سے کیا گیا ہے۔ جانتے ہیں ہندستان کے آبادکاروں کے آباء اولیں کی معرفت اس کے متعلق کن گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔ اسی کتاب کا وہ حصہ جسے ادیوگ کہتے ہیں اس کے گیارہویں ادھیائے میں ایک جن کا نام سجات جی بتایا گیا ہے ان ہی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ ''سجات جی بولے کہ برہم کا روپ کیا برنن (بیان) کروں نہ پرتھی (زمین) میں ویسا ہے نہ آکاش (آسمان) میں، نہ اس کا کوئی جسم ہے نہ وہ سمندر میں ہے نہ ستاروں میں، نہ بجلی میں نہ بادل میں، نہ چندرماں آدنکشتروں میں دکھائی دیتا ہے، نہ سورج میں نہ اور کسی میں، کنتو اس کا روپ اپارینہ ہے۔'' اپارینہ کا ترجمہ مترجم[2] صاحب نے ''بے مثل و بے حد'' کیا ہے نیز اسی ادیوگ کے بارہویں ادھیائے میں صراحۃً ان الفاظ کو ہم پاتے ہیں۔

''اس برہم کی صورت کسی نظیر اور مثال سے نہیں بتائی جاسکتی اور نہ کوئی اس کے مشابہ ہے''۔

الغرض ''لیس کمثلہ شئ'' کے تعبیری لباس میں قرآن نے معرفت کی جس تنزیہی شان کو ادا کیا ہے، کیا مہابھارت کے اس فقرے میں اس کے سوا اور بھی کچھ ہے۔

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہیں ہے، صرف چند سرسری مثالوں کو پیش کر رہا ہوں، ورنہ اس قوم کی باتیں: مثلاً: ''جس کے اوپر نارائن کرپا (مہربانی) کریں، اس کا کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور جس پر پرمیشر کوپ کریں اس کو کوئی بچا نہیں سکتا۔'' (سبھا پرب ۱۴/ ادھیائے) مایفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا و ما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہ۔ (صافات: اللہ آدمی کے لیے جس رحمت کو کھولے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جسے روک دے اسے کوئی کھول نہیں سکتا)۔ اسی مضمون کی بے شمار آیتوں کے مفہوم ہی کے اعادہ کی شکل، آپ بہ کثرت اسی مہابھارت میں پاسکتے ہیں، اور قدم قدم پر اسی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہندستان کے باشندوں کی اگلی نسلوں کو جو کچھ دیا گیا تھا، جیسے دوسروں تک ان کے آبائی سرمائے کو قرآن نے واپس کیا ہے۔ اسی طرح اس ملک کے صحیح موروثی دین کو ان کے وارثوں تک وہ پہنچانا چاہتا ہے، لوگوں کو معلوم نہیں ہے، ورنہ توحید ہی نہیں، مذہب کی عملی زندگی کی بِرّ و اثم

یعنی پاپ پن یا نیکی اور بدی کے قانون کی تابع ہے، یہ عام اسلامی نظریے اور جو کچھ اسکی تفصیلات ہیں، ایک ایک جز اس کا بھی آپ کو مہابھارت ہی میں مل سکتا ہے۔ اسی قانون کا ذکر ایک جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے یعنی ''پاپ پن، دونوں پھل وایک (نتیجہ خیز، بارآور) ہیں ایک سے سرگ (جنت) اور دوسرے سے نرک (النار) ملتا ہے۔ (ادیوگ ادھیائے، ۱۱) اور یہ کہ آدمی تپ اس لوک (دارِ دنیا) میں کرتا ہے اور پھل اس کو دوسرے لوک (عالم آخرت) میں پاتا ہے۔ نیز: ''پُن سے پاپ کا ناش ہوتا ہے''۔

اسی کے ساتھ یہ بھی کہ: ''جو کوئی منش (آدمی) پاپ کرم (گناہ کا کام) کر کے پشچا تاپ کرتا ہے (یعنی پچھتاتا اور نادم ہوتا ہے) وہ پچھلے کئے ہوئے پاپ سے چھوٹ جاتا ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ پھر ایسا پاپ کرم نہیں کروں گا وہ اس کئے ہوئے پاپ کا پھل نہیں پاتا ہے۔'' (پن پرب ادھیائے، ۹)

"برّ واثم" یا نیکی اور بدی کے ان ہی کلیات پر تصدیق کی مہر ثبت کر کے موجودہ زندگی کے انجام کو قرآن نے جب بے نقاب کیا ہے تو پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ ہمارے وطن کے باشندوں کی طرف بھی اس کے خطاب کا رخ نہ تھا جن کی کتابوں میں نیکی اور بدی کے قانون کے ان تمام پہلوؤں کو ہم پاتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، آخر آپ ہی بتائیے قرآنی آیات: مثلاً: لها ما کسبت و علیها مااکتسبت (البقرہ: یعنی ہر شخص کو اپنے بھلے کاموں کا نفع ملتا ہے اور برے کاموں کا نفع بھی ملتا ہے، برے کاموں کا وبال بھی اسی پر عائد ہوتا ہے)۔

یا: ان الحسنات یذهبن السیات ''بھلائیاں (پن) برائیوں (پاپ) کو زائل کر دیتی ہیں۔'' اور یہ کہ: والذین اذافعلوا فاحشة اوظلموا انفسهم ذکروا الله فاستغفروا لذنوبهم ولم یصرو اعلیٰ ما فعلو ا و هم یعلمون، او لیك جزاء هم مغفرة من ربهم (آل عمران)

(جن لوگوں نے بے حیائی کا کام کیا یا اپنے اوپر ظلم توڑا، یاد آیا ان کو اللہ، پھر معافی چاہی اپنے گناہوں کی، اور جو کچھ کر گزرے اس پر اصرار نہ کیا، بحالیکہ وہ جان رہے ہیں کہ ان کا صلہ ہے اپنے مالک کی طرف سے آمرزش!)

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر مروج غیر متداول کتابوں ہی میں نہیں بلکہ اسی مہابھارت میں جب یہ موجود ہے کہ نیکی آدمی اس لوک (دنیا) میں کرتا ہے اور پھل اس کا دوسرے لوک (عالم آخرت) میں پاتا ہے اور اس کے بعد سرگ، نرک کا ذکر کر کے بار بار ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً سرگ (الجنۃ) کا تذکرہ کرتے ہوئے:

''سرگ اس لوک (عالم) ہے جہاں سب پدارتھ (سازوسامان) موجود ہیں، وہاں رہنے والوں کو بھوک پیاس، سردی گرمی کچھ نہیں لگتی۔''

بہشتی نعمتوں کی ایک طویل فہرست جس میں ملبوسات مطعومات، مشمومات، مسموعات، ملموسات ۳۳ الغرض سارے حسی لذائذ کی تفصیل کے بعد آخر میں ہے: ''اس دیہہ (جسم) سے جو دب دیہہ (نورانی جسم) کہلاتی ہے، جس میں نہ بڑھاپا ہے، نہ جوانی ہے ہمیشہ ایک چیتن روپ رہتی ہے، سرگ باس ملتا ہے، وہاں سوائے ہرکھ (سرور) کے شوک

پیڑا (دکھ کی تکلیف) نہیں ہے۔'' (بن پرب ادھیائے، ۱۱)۔

اور اسی کے مقابلہ میں نرک کے متعلق: ''گھور نرک جہاں اندھیرا ہے، رچھس (یا ملائکہ غلاظ شداد) پیڑا (تکلیف) دیتے ہیں۔'' (بن پرب ادھیائے، ۱۱)۔

شاید ہی کوئی حصہ مہابھارت کا ہوگا جو انسانیت کے اس آخری انجام یعنی الجنۃ و النار کے ذکر سے خالی ہو، پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ یھودیا موجودہ یہودیت جس کی آسمانی کتاب کو جنت اور دوزخ ہی نہیں بلکہ اس لوک اور عالم کے بعد دوسرے لوک یا عالم کی زندگی کے ذکر سے ہم قطعی طور پر خاموش پاتے ہیں، اس دین کو تو محض یورپ والوں کی اس قسم کی مصنوعی تقسیموں یعنی سامی و آریائی و تورانی وغیرہ حصوں میں مذہبی قوموں کو بانٹ کر یہ فیصلہ جو کر دیا گیا ہے کہ اسلام اور یہودیت و نصرانیت تو دین کی سامی قسم میں شریک ہیں اور ہندستان وغیرہ میں جو دین اور دھرم پھیلا ہوا تھا وہ دین کی آریائی شکل ہے، حالانکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے متعلق چاہے کہنے والے کچھ ہی کہیں لیکن اسلامی دین جسے قرآن نے اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اصولاً دین کی یہ کوئی نئی شکل و صورت نہیں ہے، بلکہ ساری انسانی نسلوں کا جو حقیقی موروثی اور آبائی دین اور دھرم تھا اسی کو ہر قسم کی خارجی آمیزشوں سے پاک وصاف کر کے قوموں کے حوالہ کر دینا یہی اس کا واحد نصب العین ہے۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں:

از قبائے لالہ ہائے ایں چمن　　پاک شست آلود گیہائے کہن

قرآن کے پیش کرنے والے پیغمبر کی سب سے بڑی خصوصیت جب یہی ہے تو ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ہندستان جیسے عظیم ملک کے باشندوں کو قرآنی دائرے کے مذکورۂ بالا احاطہ سے خواہ مخواہ باہر سمجھا جائے بلکہ تحقیق و تلاش سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندستان کا آبائی اور موروثی دھرم قرآن کے پیش کیے ہوئے دین سے جتنا زیادہ قریب اور نزدیک ہے، شاید یہ نزدیکی ان دینوں اور مذہبوں کی موجودہ شکلوں کو بھی بہ مشکل میسر آسکتی ہے جن کو یورپ والوں کی مذکورۂ بالا فرضی تقسیم کی رو سے سامی ادیان کی فہرست میں، ہم شریک پاتے ہیں، حالانکہ محض چند سرسری باتیں، اور وہ بھی صرف ایک کتاب مہابھارت کے مختلف مقامات سے اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں، لیکن قرآن کے پڑھنے والوں سے میں حق کی گواہی کی درخواست دیتا ہوں، توحید فی الحق، توحید فی العبادۃ، توحید فی الافعال یا قانون بُرّ واثم'' (نیکی و بدی) اس قانون کے نتائج الجنۃ والنار ، توبہ واستغفار : الغرض ان سارے اصولی حقائق جن پر قرآنی تعلیم کی بنیاد قائم ہے، کیا وہی ساری باتیں مہابھارت میں بھی نہیں مل رہی ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ بعض فقرے مہابھارت کے مذکورۂ بالا حوالوں میں ایسے بھی ہیں کہ قرآن کی عربی عبارت کے سامنے بطور ترجمہ کے ہم ان کو بآسانی درج کر سکتے ہیں۔

اور یہ قصہ صرف مبدءٔ و معاد، نیکی و بدی ہی کے تفصیلات تک محدود نہیں ہے بلکہ اخلاقی فضائل ورذائل کی جو فہرست اسلام میں پائی جاتی ہے بجنسہٖ یہی فہرست ویدک دھرم کی بھی ہے، بلکہ ایسی چیزیں جو عموماً اسلام کے ساتھ مختص سمجھی جاتی ہیں مثلاً جوا، شراب خوری، ان کی حرمت کا بھی بار بار ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے، قمار (جوا) کی اہمیت تو

اسی سے ظاہر ہے کہ مہابھارت کا موضوع ہی ایک حیثیت سے اگر سمجھا جائے تو قمار یعنی جوئے ہی کے نتائج اور انجام کو بیان کرنا ہے، یہی بتایا گیا ہے کہ یہ ساری خونریزیاں جو مہابھارت کی جنگ میں ہوئیں اور جیسا کہ اس کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کروڑہا کروڑ انسان جو اس جنگ میں مارے گئے سب کا خون کورو اور پانڈو خاندان کے شاہزادوں کے جذبۂ قمار بازی کے سر عائد ہوتا ہے۔ گویا جوابازی کے نتیجے کو دکھلانے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب مرتب کی گئی، مگر حیرت ہوتی ہے کہ بہت سی باتیں جو ہندستان میں عموماً مروّج ہیں بلکہ عام طور پر دین اور دھرم کے نام لینے والے جن اعمال کو اپنی خصوصیت قرار دیئے ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی اسی مہابھارت میں وہی نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے جو اسلام کا ہے، مثلاً ادیوک کے دسویں ادھیائے میں بدرجی کا ایک طویل اپدیش کو نقل کرتے ہوئے ان فقروں کو بھی ان ہی کی طرف منسوب پاتے ہیں کہ :

"تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر کٹھور بچن کا زخم کبھی نہیں بھرتا، جب تک انسان کی نیک نامی دنیا میں رہتی ہے تب تک وہ زندہ سمجھا جاتا ہے۔"

"قسم کھانے والے کی بات کا اعتبار نہیں رہتا۔"

اور اسی سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ:

"شاہد ریکھ" یعنی ہاتھ کی ریکھا دیکھنے والا شگون بتانے والا جوتشی" ان سب کو: "بے شرم بھڑوا، گریہہ گرانے والا، اپنی استری (عورت) کا خرچی کھانے والا، برہمن ہوکر شراب پینے والا۔" کی فہرست میں شریک کیا گیا ہے، حالانکہ آج ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والے اور شگون بتانے کا پیشہ کرنے والے ہی اس ملک میں دین کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں، یہی نہیں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ بھکشا لینا اور بھیک مانگنا یہی برہمن کا مذہبی فریضہ ہے، لیکن اسی مہابھارت میں ہم بھکاری اور گداگر برہمن کے متعلق یہ الفاظ پاتے ہیں: "جو برہمن سوال کرنے والا ہوتا ہے اس کی عزت نہیں ہوتی، مان اس کا دور ہو جاتا ہے، سوال کرنے والے برہمن کا حال چور کا سا ہوتا ہے۔" اور آخر میں ہے: "بھیک مانگنے والا مرتا ہے دان کرتا کبھی نہیں مرتا[۵]" (انوساس پرب چودھواں ادھیائے)۔

اسی طرح آج "بیاج" یعنی ربا یا سودخواری اس ملک میں جس قوم کا خصوصی پیشہ سمجھا جاتا ہے اسی کی دینی کتاب میں ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ: "بیاج (سود) کھانے والے کا ان (کھانا) نشٹا (گوہ) سمان (مانند) کہا ہے۔" (شانتی پرب ادھیائے ۱۲)۔

پانی سے تطہیر یا پاکی تو خیر عام بات ہے لیکن ہماری فقہ کا ایک جزیہ کہ آفتاب سے چیزیں پاک ہوتی ہیں ٹھیک اسی جزیئہ کو ان الفاظ میں آپ مہابھارت میں بھی پاویں گے کہ: "سورج کی کرن سے سب وستو (چیزیں) پوتر (پاک) ہوتی ہیں۔" (ادی پرب ادھیائے ۴)۔

حد یہ ہے کہ غسل کے ساتھ قریب قریب وضو کے مسئلہ کو بھی آپ چاہیں تو پا سکتے ہیں، عبادت کرنے سے پہلے

کیا کرنا چاہئے اسی کا جواب دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے : ''ممکن ہو تو اشنان (غسل) کر لے، نہیں تو ہاتھ پاؤ دھو کر آچمن (کلّی) کر کے شدھ (پاک) آسن (جگہ) بیٹھ کر نارائن (خالق عالم) کا سمرن ذکر دھیان جپ وغیرہ کرے۔'' (شانتی پرب ادھیائے، ۱۴)۔

اسی طرح صدقہ خیرات تو خیر مذاہب وادیان کی عام بات ہے لیکن مہابھارت میں اطلاع دی گئی ہے کہ سب سے پہلے منوجی نامی راجہ کو راج ملا، اوران سے پرجانے وعدہ کیا کہ آپ ''ہمارا پالن کریں، ہم پشوؤں کا، اور سونے کا، پچاسواں بھاگ (حصہ) اور اناج کا دسواں حصہ خزانہ کی ترقی کے لیے تمہارے خزانے میں داخل کریں گے۔'' (شانتی پرب ادھیائے، ۴۹)۔

زکوٰۃ کے قانون کی تشکیل کرتے ہوئے پشوؤں (السوائم یعنی بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ) اور زر و نقرہ سے اسلام نے جس قدر زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا ہے اور عشر یعنی دسواں حصہ زمین سے پیدا ہونے والے اناج کا صدقہ جو طلب کیا گیا ہے اس کو اپنے سامنے رکھئے اور مہابھارت کی مذکورہ اطلاع کو پیش نظر رکھئے اور غور کیجئے ان قرآنی آیات پر جن میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے اگلے باپ دادوں کے پاس جو کچھ آیا تھا کیا اس کے سوا قرآن تمہیں کچھ اور دے رہا ہے، یا ارشاد ہوا ہے لیهديكم سنن الذين من قبلكم (النساء) (تا کہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں ان کے طور اور طریقوں کی طرف تمہاری راہ نمائی کی جائے)۔

قرآن کے ان دعوؤں کی تصدیق کے لیے میں نہیں سمجھتا کہ اور کیا چاہا جاتا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے : جرائم کے سلسلے میں چوری کے جرم کی سزا قرآن میں جیسا کہ مشہور ہے یہ مقرر کی گئی ہے، خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور حضرت یعقوب علیہ السلام جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا، اور ان ہی کی طرف منسوب ہو کر یہود بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئے، ان ہی یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کی زبانی قرآن میں چوری کی سزا ان کے پاس مروّج تھی، یہ بتایا گیا ہے کہ چوری کا مال جس کے پاس نکلے خود اسی چور پر مال کا مالک قبضہ کرے، سورۂ یوسف میں یہ مشہور اعتراف حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کا منقول ہے قالوا جزائه لمن وجد في رحله فهو جزائه كذالك نجزي الظالمين۔ (یوسف) (یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں نے) کہا کہ بدلہ اس کا یہ ہے کہ جس کے سامان میں چوری کا مال ملے وہی اس کا بدلہ ہے، ہم ظلم کرنے والوں کو یونہی سزا دیتے ہیں)۔

جس سے معلوم ہوا کہ چوری کے انسداد کے لیے اپنے خاص حالات کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے لیے قطع ید (ہاتھ کاٹنا) کافی نہ تھا کٹے ہوئے ہاتھوں کے باوجود بے شرمی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چور چوری سے باز نہیں آتے تھے، اس لیے اس سے زیادہ سخت سزا ان کے یہاں غالباً مروّج ہوگئی تھی۔ لیکن آیئے اور دیکھئے ویدک دھرم جسے شمار کرنے والے سامی مذہب کے مقابلہ میں آریائی دین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں اس میں اسی چوری کے جرم کی سزا کے متعلق جو آگاہی مہابھارت ہی سے حاصل ہوئی ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص چوری

کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور وقت کے راجہ سودمن کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ خود چور درخواست کرتا ہے کہ: ''جو ڈنڈ (سزا) چور کا ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو''۔ راجہ نے چوری کی سزا دیتے ہوئے چور کے متعلق حکم دیا کہ ''دونوں ہاتھ کاٹ دو''۔ (شانتی پرب ادھیائے، ۸)

بتائیے کہ اصولاً وفرعاً کس لحاظ سے ہم یورپ والوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوسکتے ہیں کہ ہندستان کے آریائی دھرم کا قرآن کے سامی دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، حالانکہ میں نے اجمال اور بہت زیادہ اجمال سے کام لیا ہے، لیکن اس وقت تک جن معلومات کو پیش کر چکا ہوں، اس وہمی اور فرضی بلکہ درحقیقت خودغرضانہ سیاسی دعویٰ کی تردید کے لیے کیا وہی کافی نہیں ہیں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ مہابھارت میں بعض موقعوں پر لوگوں کے جو مکالمے نقل کیے گئے ہیں ان کو پڑھ کر آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ کتاب کیا اسی زمانہ میں لکھی گئی ہے جس سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں؟ ایک جگہ یدھشٹر فاتح اور بھیشم پتاما کی باہمی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے یدھشٹر کی طرف سوال منسوب کیا گیا ہے کہ: ''یدھشٹر نے پوچھا مہاراج! منش (آدمی) کے شریر (بدن) کو اسی جگہ جلا دیتے ہیں یا پرتھی میں گاڑ دیتے ہیں۔'' (انوساسن پرب ادھیائے، ۲۰)۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آج تو ہندستان میں اپنے مردوں کو جلاتے اور مسلمان گاڑ دیتے ہیں لیکن یدھشٹر کے مذکورہ بالا سوال سے کیا یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جلانے کے ساتھ ساتھ تدفین کا عمل اس ملک میں مہابھارت کے زمانہ میں جاری تھا، حالانکہ یہ رسم و رواج کی بات ہے لیکن اس لحاظ سے بھی دیکھیے تو آج جو کچھ یہاں دیکھا جا رہا ہے کل بھی یہی دیکھا جا رہا تھا۔

اور میں اس سلسلے میں کہاں تک لکھوں، حد سے زیادہ اختصار کے ارادے کے باوجود خواہ مخواہ بات میں بات یاد آتی چلی گئی اور میں لکھتا گیا، ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ ادیان و مذاہب کو آریائی اور سامی وغیرہ فرضی خود تراشیدہ تقسیموں کے گورکھ دھندوں میں پھنسا کر یورپ والے سیاسی اغراض کی تکمیل میں جو کام لیتے ہیں، چاہیے کہ لوگ ان کی شاطرانہ طریقۂ عمل سے چوکنا رہیں اور نظر ہمیشہ حقیقت پر رکھنی چاہیے۔ حالانکہ بہت کم کہا گیا ہے لیکن بقدرِ ضرورت اصول و فروع رسم و رواج کے لحاظ سے جن جن باتوں کا ذکر سردست میں کیا ہے فیصلہ تک پہنچنے کے لیے انشاء اللہ ان سے بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ جیسے مسلمانوں میں مختلف اسباب و مؤثرات کے زیرِ اثر بعد کو مختلف خیالات اور نت نئے دینی نظریات پیدا ہوئے، اسی حادثہ کا شکار ہندستان کا آبائی اور موروثی دین بھی ہوا ہے۔ ہندو دھرم کی تاریخ کتابوں میں محفوظ بھی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ مختلف زمانہ میں مختلف عقائد و خیالات کے زیرِ اثر اس ملک کے باشندے رہے ہیں۔ خود اسی کتاب مہابھارت ہی کے پڑھنے سے ان مختلف نظریات و خیالات کا اندازہ ہوتا ہے، بلکہ مہابھارت ہی کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ عقائد و خیالات کی گونا گونی، رنگارنگی سے لوگ پریشان تھے۔ شانتی پرب کے ادھیائے ۹ میں گالو رشی کی طرف یہ فقرہ منسوب کیا گیا ہے: نارد جی کو خطاب کر کے نو رشی نے کہا ''بہت سے شاستروں کے ہونے سے

کلیان (اطمینان) بہت گپت (غائب) ہورہا ہے"، "ہے نارد جی شاستر ایک ہی ہوتو سندیہہ (شک وشبہ) نہ ہو سکے"۔
آخر میں بولے: "اسی لیے (یعنی شاستروں کی کثرت کی وجہ سے) مجھے بہت سندیہ (شک وشبہ) ہے آپ ان کو دور کیجیے"۔

بہر حال مہابھارت ہی کے زمانہ میں جب یہ حال تھا تو اس کے بعد کیوں تعجب کیا جائے؟ اگر آج ویدک دھرم کے ماننے والوں میں مذکورۂ بالا بہت سی چیزیں نہیں پائی جاتیں خصوصاً خالق عالم ہی کی عبادت اور اسی کی پوجا موکش (نجات) کا واحد ذریعہ ہے۔ اس کا یقین اس ملک کی عمومیت میں باقی نہیں رہا ہے، حالانکہ اسی شانتی پرب کے ادھیائے (۵۸) میں "اتم مارگ" صراط مستقیم و "طریقہ وسطیٰ" یا سب سے بہتر راہ کے متعلق مکالمہ شیوجی اور برہماجی کے درمیان نقل کرتے ہوئے ایک فقرہ برہماجی کی طرف یہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ: "ہے راجن! اسی نارائن پرب برہم کو پوجنا جوگ (واجب) ہے جو سب کا اتپت استھان (مصدر وسرچشمہ) ہے"۔
آخر میں ہے: "اسی کے پوجنے سے موکش (نجات) پراپت میسر ہوتا ہے"۔

ویدک دھرم کے قدیم مذہبی وثائق (ویدیا اپنشد او غیرہ) میں نہیں بلکہ مہابھارت جیسی عام کتاب جو شاید اب بھی ہندو گھرانوں میں روزانہ پڑھی جاتی ہے جب اس میں بھی یہ موجود ہے کہ نجات اور مکتی کا جو طالب ہے اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ خالق عالم ہی کی عبادت کرے اور اسی کو پوجے، اسی سے لَو لگائے مگر باوجود اس کے اس عقیدہ کا دباؤ ملک کے عام آبادکاروں پر سے کیوں اٹھ گیا۔ اور یہی نہیں بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اسی مہابھارت میں جہاں مذکورۂ بالا توحیدی عقائد وخیالات ملتے ہیں، وہیں اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس عقیدے کی مخالفانہ شہادتوں کو بھی ہم اسی کتاب میں پاتے ہیں اور بہ کثرت پاتے ہیں:

بنیادی حقیقت اور جوہری عنصر "یعنی پاپ پن" نیکی اور بدی "برّ واثم" کے نتائج کے سلسلے میں یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ سرگ اور نرک یا الجنۃ والنار تو انسانی علم وعمل، گیان اور کرم کا آخری انجام ہے، جو قیامت اور فیصلہ کے بعد سامنے آئے گا "آدمی تپ اس لوک (دار دنیا) میں کرتا ہے اور پھل اس کو دوسرے لوک (عالم آخرت) میں پاتا ہے" (بن پرب ادھیائے، ۹)۔

بکثرت مہابھارت میں اس مضمون کو دہرایا گیا ہے استری پرب کے تیسرے ادھیائے میں یہ کہتے ہوئے کہ "کوئی بالک پنے (بچپن) کوئی ترن اوستھا (جوانی) کوئی بڑھاپے میں شریر (بدن) چھوڑتے ہیں۔" آخر میں ہے: "اس اسار (ناپائیدار) سنسار میں رہنا کسی کو نہیں ہے۔"

خود مہابھارت کی تالیف جس کی طرف منسوب ہے یعنی ویاس جی نے یدھشٹر کو یہ سمجھاتے ہوئے کہ جنگ میں جو مارے گئے ان کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے، کہا تھا کہ "اس بھاری سنگرام (جنگ) میں جو مارے گئے وہ کسی پرکار سے پھر (لوٹ) نہیں سکتے۔" (شانتی پرب ادھیائے، ۷)، "کسی پرکار" کا لفظ قابل غور ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ

مرنے والے پھر اس دنیا میں خواہ کسی شکل میں ہو واپس نہیں ہو سکتے، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے یہ واقعہ ہے کہ عام طور پر ہندستان میں یہی خیال پھیل گیا کہ اسی سنسار اور دنیا میں جو چلتے پھرتے جانور، چرند، پرند اور درند نظر آتے ہیں، کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ مرے ہوئے آدمیوں کو پھر اس دنیا میں ان جانوروں کے جون اور قالب میں چلنے پھرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ گویا یہ یادرکھا جاتا ہے کہ ''اواگمن'' کا نظریہ جس کا عام تلفظ اواگون ہے اس کا مطلب یہی ہے۔

فلسفہ کی عربی کتابوں میں ''تناسخ'' کے جس مسئلہ کا ذکر پایا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ اسی کے قائل ویدک دھرم کے ماننے والے بھی ہیں۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر بہت سے لوگ جنھوں نے ویدک دھرم کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے، وہ خیال کرتے ہیں کہ جنت و دوزخ کا عقیدہ سامی مذاہب کی خصوصیت ہے، اور آریائی دیانات میں بجائے جنت و دوزخ کے عقیدہ کے، تناسخ کا عقیدہ مانا جاتا ہے۔ خود مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگوں سے یہ سن کر مجھے تعجب ہوا، حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سرگ اور نرک الفاظ سے ویدک دھرم میں وہ سب کچھ مانا جاتا ہے جسے مسلمان الجنۃ والنار کی تعبیروں میں ادا کرتے ہیں، گفتگو صرف درمیانی وقفہ کے متعلق ہے۔ جس سے قیامت سے پہلے ہر مرنے والے کو موت کے بعد سابقہ ہوتا ہے عام طور پر مسلمانوں میں برزخ کے لفظ سے اس وقفہ کو موسوم کرتے ہیں؛ اگر اواگمن کے نظریہ کا تعلق بجائے موجودہ دنیا کے برزخ ہی کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ یہ سامی اور آریائی تقسیم کا کھیل یورپ کے سیاسی بازیگروں کا کھیلا ہوا صرف عقلی تلاعب بن کر رہ جاتا ہے اور بے شمار منطقی تضاد اور تناقص سے بھی وہ عقیدہ پاک ہو جاتا ہے جسے ویدک دھرم والوں کی طرف منسوب کرنے والوں نے منسوب کر دیا ہے۔[۶]

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ جیسے مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے اسلامی عقائد و مسلمات کی تشریح مختلف شکلوں میں کر کر کے اپنا ایک خاص مسلک بنالیا ہے اور کوئی کسی کو اپنی تشریح کے ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا، تو پھر ویدک دھرم کے مختلف مکاتیب خیال اور اسکولوں میں اس مذہب کے مسلمات کی جو تشریحیں آج مانی جا رہی ہیں، ہم بزوران تشریحوں کے ماننے سے ان کو کیسے باز رکھ سکتے ہیں، بلکہ مسلمانوں کو تو گونہ گنجائش بھی ہے کہ ان کی آسمانی کتاب (قرآن عزیز) تاریخی طور پر ہر قسم کی بیرونی آمیزشوں سے اس وقت تک پاک ہے اس کو وہ بھی مانتے ہیں اور ماننے پر مجبور ہیں جنھوں نے ابھی قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم نہیں کیا ہے، اسی لیے مسلمانوں پر تو یہ اصرار شاید بے جا اصرار نہ ہوگا کہ کم از کم قرآن کے حدود سے تو باہر نہ ہوں، لیکن مہابھارت جیسی ضخیم کتاب جس میں سب ہی طرح کی باتیں ملی جلی پائی جاتی ہیں، ہر خیال والے اپنی تائیدی شہادت اسی کتاب سے حاصل کرتے ہیں اور کر رہے ہیں بقول ملا عبدالقادر بدایونی ہیژدہ ہزار عالم اس کتاب میں پوشیدہ ہیں اس لیے اس کتاب کے ماننے والوں کا مسئلہ کافی دشوار ہو گیا ہے۔ کانٹوں سے پھول عقل کے زور سے چننا آسان نہیں ہے، غریب عقل نے بسا اوقات کانٹوں کو پھول اور پھولوں کو کانٹا باور کر لیا، انسانی عقل کی تاریخ اس کی مشاہد ہے قرآن نے جو یہ پوچھا تھا کہ ''ان کے پاس کیا کوئی ایسی باتیں آئی ہیں، جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہ آئی تھیں''۔

اس سوال کا رخ جیسے دنیا کی دوسری قوموں اور امتوں کی طرف ہے، اسی طرح واقعات کی روشنی میں دکھانا چاہتا تھا کہ ویدک دھرم والوں کے یاں بھی ہمیں وہی چیزیں ملتی ہیں جنھیں قرآن کے ذریعہ آخری دفعہ قدرت نے بنی آدم کے سپرد کرنا چاہا ہے؛ خواہ ان چیزوں کو ان کے حقیقی خط وخال کے ساتھ ماننے والے مان رہے ہوں یا نہ مان رہے ہوں، لیکن ملنے کی حد تک آپ نے دیکھ لیا کہ جیسے دوسروں کے یاں ہمیں قرآنی تعلیمات کی پرچھائیاں ملتی ہیں، اسی طرح ویدک دھرم کے آئینے میں بھی ان ہی تعلیمات کی تصویروں کا ہم نظارہ کرسکتے ہیں؛ بلکہ کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندستان کے دینی آئینے میں یہ تصویریں جتنی زیادہ نمایاں ہیں شاید دنیا کے دوسرے ادیان و مذاہب کی موجودہ شکلوں میں ہم ان کو نہیں پاسکتے۔

اگرچہ یہ ضمنی بات ہے لیکن پچھلے چند دنوں سے یورپ ہی کے بے بنیاد مغالطوں کے زیر اثر لوگوں نے ہندی مسلمانوں پر یہ الزام جو تھوپنا چاہا کہ اس ملک کے کلچر سے ان کا کلچر مختلف ہے اور باہر سے درآمد ہوا ہے قدرتاً اس وقت اس کا خیال آگیا جب کبھی اس ''کلچری'' اعتراض کی خبر میرے کانوں تک پہنچی، پہلے تو یہی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک ہی ملک کے باشندوں میں بعض دوسرے طبقات کے کلچر کو غیر ہندی کلچر قرار دینے کی بنیاد آخر کس منطق پر قائم ہے۔ ہندی کلچر ہندستان کے رہنے والوں کا ہے، خواہ وہ دراوڑ کلچر ہو، بدھسٹ کلچر ہو یا اسی ملک کے ان باشندوں کا کلچر ہو جن کا مذہب اسلام ہے۔ وطن ہونے کی حیثیت سے ہندوستان سب کا وطن ہے، بلکہ جو ناستک یا ادھرم بے دین اور ملحد لوگ ہیں ان کو آپ اور جو کچھ جی میں آئے کہیے لیکن یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان ان کا وطن نہیں ہے اور وہ اس ملک کے وطنی حقوق سے محروم رہیں گے اور یہ تو خیر عام بات ہے اس موقع پر ذیلاً جس چیز کا مجھے خیال آیا وہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ اعتراض کہ ان کا کلچر ہندی کلچر نہیں ہے، اگر کلچر کے اس لفظ میں دینی احسانات وعقائد وخیالات بھی شریک ہیں اور غالباً مسلمانوں کا امتیازی ذکر ان کے دین اور مذہب ہی کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ تو آپ دیکھ چکے کہ اصولی اور بنیادی عقائد ہی نہیں بلکہ جزئیات اور فروع تک مسلمانوں کے دین کی کسی اور کتاب میں نہیں، مہابھارت تک میں بھی جب پائے جارہے ہیں تو دین اور مذہب کی وجہ سے مسلمانوں کے کلچر کو غیر ہندی کلچر قرار دینے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی تو ہوا کہ مہابھارت بھی ہندی کلچر سے خارج ہے۔ اب میں کیا عرض کروں، عموماً اس قسم کی باتیں وہی کرتے ہیں جنھوں نے نہ مسلمان ہی کے دین کا مطالعہ کیا ہے اور نہ ویدک دھرم کی کتابوں کو انھوں نے صحیح معنوں میں سمجھنے کی کوشش کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ قرآن جس نے مسلمانوں کو ساری دنیا کے سچے ادیان اور صادق مذاہب کی صحیح تعلیمات کا جائز وارث بنادیا ہے۔ اسی وجہ سے:

دردلِ حق سرِّ مکنونیم ما ۔۔۔ وارث موسیٰ و ہارونیم ما

کا بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم مسلمان بجا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا کلچر قدرتاً ساری دنیا کا عالمگیر کلچر بن گیا ہے، ان کے لیے نہ کسی ملک کا کلچر اجنبی ہے اور نہ وہ کسی کلچر کے لیے اجنبی ہیں۔ اور میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ واقعات کی

روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندستان کے کلچر سے مسلمانوں کا کلچر جتنا زیادہ قریب ہے، اس قرب، اس مناسبت کا موجودہ حالات میں شاید ہی کسی دوسرے ملک کے مذہب اور دین کے ماننے والوں کے کلچر کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہوسکتا ہے۔

افسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور ہندوؤں کے ویدک دھرم کا مقابلہ صحیح علمی روشنی میں نہیں کیا گیا، سنی سنائی باتوں کو واقعات قرار دے کر اس قسم کی چیزیں ان کی کتابوں میں بھی درج ہوگئی ہیں، خود مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے، اس میں معاملہ یہ ہے کہ براہ راست ہندوؤں کی کتابوں کو پڑھنے کا موقع ان لوگوں کو نہیں ملا۔ اس لیے وہ ہندو دھرم کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار رہیں۔

حواشی:

۱ ملائکہ جن ارواح طیبہ، وخبیثہ کے متعلق ہندو ادبیات میں یہی الفاظ مستعمل ہیں، جلکس ومنش جن و انس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔

۲ مترجم صاحب سے میری مراد منشی شری رام صاحب ماتھر دہلوی ہیں، جنھوں نے چار ضخیم جلدوں میں کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ مہا بھارت کا اردو میں کامیاب ترجمہ کیا ہے، مطبع نولکشور میں متعدد بار یہ ترجمہ چھپا ہے، میرے پیش نظر ۱۹۱۴ء کا مطبوعہ نسخہ ہے، سارے حوالے مہابھارت کے اسی ترجمہ سے ماخوذ ہیں۔

۳ مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی حاسہ کے ساتھ جن جن لذتوں کا تعلق ہے سب ہی کا ذکر ویدک دھرم کے سرگ میں کیا گیا ہے حتیٰ کہ اپسراؤں (حوروں) کے ساتھ بھوگ بلاس کے پراپت ہونے یعنی حاصل ہونے کا ذکر بہ کثرت اس کتاب میں ملتا ہے۔

۴ استری پرب دسواں ادھیائے، میں جدھشٹر کی زبانی مقتولوں کی تعداد ایک ارب چھیاسٹھ کروڑ بیس ہزار بتائی گئی ہے۔

۵ اسی ادھیائے میں ایک فقرہ جس میں اچھے برہمن کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے ایک خاص علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جو برہمن ''ڈاڑھی مونچھ رکھنے والے ہیں ان کو نیوتہ دے کر اچھے پدارتھ کا بھوجن کرواؤ۔'' (ابوساس پرب ادھیائے ۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مونچھ ڈاڑھی ہمارے وطن میں پرہیزگار انسانوں کی علامت ہمیشہ مانی جاتی تھی۔

۶ مطلب یہ ہے کہ ہندستان میں بہت سے جانوروں کو غیر معمولی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جن میں گائے، لنگور، سانپ وغیرہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اب اگر یہ مانا جائے کہ مذکورہ بالا حیوانات سزایافتہ انسانوں کی شکلیں ہیں تو کسی گنہ گار پاپی وجود کے محترم ہونے کے معنی ہی کیا ہوسکتے ہیں؟ ماسوا اس کے مہابھارت ہی کے ادھرپ ادھیائے ۱۹ میں آفرینش عالم کی داستان کو اس قصہ سے شروع کر کے کہ ابتداء میں صرف برہم پرماتما یعنی خدا تھا اور پانی میں زمین غائب تھی، آگے بیان کیا ہے کہ کشب جی کے گیارہ جوڑوں سے ہاتھی گھوڑے، خچر، اونٹ، بھیڑ، بکری، شیر، ہرن، گائے، بیل بھینسے وغیرہ چارپائے اور باز، کبوتر، بٹیر، طوطے، مینا، گرچی وغیرہ پرندے اور سانپ، مگر اور مچھلیاں آبی جانور اور کیڑے مکوڑے وغیرہ پیدا ہوئے الخ۔ ایسی صورت میں یہ خیال کہ سارے جانور انسانوں کی سزائی قالب ہیں، کہاں تک درست ہوسکتا ہے؟

۷ مگدھ کے راجہ اشوک اعظم کے سنگی فرامین میں ساتویں فرمان میں یہ فقرہ بھی ہے کہ میرے قلم رو میں اگر کوئی لامذہب بود و باش رکھتا ہو تو اس کو اذیت نہ دی جائے، (اشوک چرتر ص ۷۰)۔

• • •

تبصرہ

کتاب: جہدِ مسلسل-علی گڑھ سے علی گڑھ تک (جولائی ۱۹۵۱ء تا مئی ۱۹۵۹ء)

مؤلف: ڈاکٹر عابداللہ غازی

ضخامت: ۳۷۶ قیمت: ۴۰۰

اشاعت اول: ۲۰۱۷ء

ناشر: اقرأ ایجوکیشن فاؤنڈیشن، شکاگو

مبصر: ب ع ر

عابداللہ غازی کی آٹو بایوگرافی کا خلاصہ ابتدا میں درج کر دیا جائے، کوشش ہو کہ الفاظ انھیں کے رہیں:

"میں نے علی گڑھ کی یادداشتیں عظیم الحق جنیدی صاحب کے دولت کدہ کی بیٹھک سے شروع کی ہیں جہاں نو اور دس جماعت کے دو سال گزارے (۵۱-۱۹۴۹) وہ ہائی اسکول کے پرنسپل تھے، مئی ۱۹۵۱ کی موسم گرما کی تعطیلات میں سلطان پور میں خالو ریاض الدین کے گھر پر تھا جب نماز فجر کے بعد لیڈر اخبار کے ذریعے مجھے درجہ دوم میں پاس ہونے کا مژدہ ملا، اس نتیجہ کا پہلے سے یقین تھا، میں کہتا تھا: فرسٹ کلاس آ نہیں سکتی اور سیکنڈ کلاس جا نہیں سکتی......"

"ڈھائی سال کی عمر میں والدہ داغ مفارقت دے گئیں تھیں پھر اباجان کی دوسری شادی نانے ابا کی والہانہ محبت پھر ان کی دوسری شادی...... انبیٹھہ؛ پھر علی گڑھ کا آغوشِ رحمت اور اب ٹی بی اور زندگی کا نیا رخ (تامبرم) ایک سال۔ (تامبرم سے پھر علی گڑھ)۔

"علی گڑھ میرے تعلیمی سفر کا وہ پڑاؤ تھا جس سے میں آج تک فکری، ذہنی اور روحانی طور سے وابستہ ہوں، اساتذہ کی شفقت، دوستوں کی بے لوث رفاقت عمل کی سرگرمی ارادوں کی پختگی، فکر کی صلابت، عزائم کی شجاعت میسر آئی، علی گڑھ تجربوں اور بعد میں اس کی یادوں نے مجھ دورِ خزاں کے پروردہ کو سدا بہار بنا دیا...... یہاں میں نے یونین کے اسٹیج پر سیکنڈائر میں (۵۳-۱۹۵۲) قدم رکھا اور تھرڈ ائر (۱۹۵۴) میں کم و بیش ہزار دو ڈبیٹ کے فرسٹ پرائزوں پر قابض ہو کر سیفی برہان الدین گولڈ میڈل کا مستحق بنا اور سیکریٹری منتخب ہوا (۵۵-۱۹۵۳)، صدارت کا الیکشن ۱۹۵۵ میں مبشر محمد خاں سے لڑا اور ناکام رہا۔ پھر (۱۹۵۹) میں بلا مقابلہ صدر منتخب ہوا اور پورے ہندستان کی یونیورسٹیوں کی تنظیم کونسل آف یونیورسٹی اسٹوڈنٹس آف انڈیا کا بانی اور پہلا صدر منتخب ہوا (۱۹۵۹) اور آزاد ہندستان کی عظیم قیادت پنڈت جلواہر لال نہرو، مولانا آزاد، راجندر پرشاد جی، سی ڈی دیشمکھ، ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی توجہ اور شفقتوں کا مرکز بن گیا۔ ذاکر صاحب اور پنڈت نہرو کی نوازش سے ہندستان کا نوجوان سفیر بن کر نئے سرخ چین جا کر سرسبز ہندستان کے نوجوانوں کی نمائندگی (۱۹۵۵) کی......

''علی گڑھ سے نکل کے جامعہ ملیہ اور دلّی کالج کی خدمت میسر آئی...... پھر لندن اسکول اور اکنامکس (۱۹۶۳)، وہاں سے ہارورڈ (میں تعلیم مکمل کی، ۱۹۶۶)...... شکاگو میں اقر اُ انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی (۱۹۸۳)...... ممبئی میں اقر اُ انٹرنیشنل کی برانچ ۱۹۹۹ء میں قائم کی...... ابا جان (حامد الانصاری غازی) کے نام پر غازی ایجوکیشنل ٹرسٹ کی بنیاد رکھی...... سنگاپور کے مجلس علما کے مدارس کے لئے انگریزی زبان میں ایک سو اسی کتابوں پر مشتمل معہد مدرسہ کا مکمل پروگرام علما ہند کی مدد سے تصنیف کروایا جواب سنگاپور میں رائج ہے''۔

یہ ہوئی عہد علی گڑھ کی روداد! مصنف ہی کی زبانی ان کی زندگی کا ایک اور خلاصہ بھی :

''میرا علی گڑھ کا طالب علمی کا دور آٹھ سالوں پر محیط ہے۔ اول پانچ سالوں میں میں نے بی اے فرسٹ کلاس پاس کیا یونین کا سکریٹری منتخب ہوا اور صدارت کا الیکشن ہارا۔ چھٹا سال میں نے تا مبرم سینیٹوریم امدراس میں گزارا۔ اس سال اگرچہ میں علی گڑھ سے دور رہا لیکن میں اس سال کو بھی علی گڑھ کا ہی سال سمجھتا ہوں کیوں کہ میں علی گڑھ کے طالب علم کی حیثیت سے تامبرم سنی ٹوریم گیا تھا اور تامبرم سینی ٹوریم میں علی گڑھ کے احباب کی محبت اور تعلق کے سہارے ہی وقت گذرا اور پھر وہاں سے علی گڑھ نے بہت محبت اور کج ادائی سے میرے ارادوں کے برخلاف مجھے بلالیا۔ دوسرا علی گڑھ کا دور جولائی ۱۹۵۷ء سے شروع ہوکر ۱۹۵۹ء پر ختم ہوتا ہے۔ جس میں میں نے سید آصف علی کا الیکشن لڑایا اور خود دوسرے سال میں بلا مقابلہ اسٹوڈنٹ یونین کی صدارت اور نیشنل کانفرنس آف یونیورسٹی اسٹوڈنٹس آف انڈیا کی چیر مین شپ کے لیے منتخب ہوا''۔

عابداللہ غازی کا اسلوبِ بیان بڑا دلآویز ہے، رواں دواں! صنعت کاری بھی ہے تو بے ساختہ معلوم ہوتی ہے۔ تقریر ایسی کہ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی! تحریر ایسی کہ پڑھا کرے کوئی! جا بجا کہنے کا تیکھا اسلوب، بڑی سے بڑی نا گوار بات کو بھی خوبصورتی سے ادا کر جانا، کبھی کبھی تو ایسی خوبصورتی سے کہ مخاطب اس کا شکار بھی ہو تو ایسا جھیلے کہ بے ساختہ مسکرا اٹھے۔ یوں بھی طالب علمی کے زمانے میں تقریر کیا اور تحریر کیا، تیکھے سے تیکھا وار، کچھ دیر کے بعد میٹھا لگنے لگتا تھا زبان و بیان پر پورا قابو؛ جس جملے کو جس جگہ یکا یک موڑ دینا ہو، وہاں، بغیر ٹھہرے، بلا جھجکے : کہنا ہے تو کہنا ہی ہے۔ بس اتنا ہے کہ الفاظ بھی ایسے ہوں (تحریر میں) اور آواز بھی ایسی ہی ہو (تقریر میں) کہ سننے والا پڑھنے والا سہہ جائے، مسکرا اٹھے، اور زبان سے نہ سہی تو دل میں تو appreciate کرتا ہی جائے : بڑی دل آویزی تھی ان کی تحریر میں! عابداللہ غازی یونین کے پلیٹ فارم پر تقریر کے فن میں تو جادو جگاتے ہی تھے، تحریر میں بھی اگر 'فضولیات' سے وقت بچ جاتا تو کچھ دوامی نقش چھوڑ جاتے۔ ان کی تحریر کی ایک بڑی خصوصیت ہے شگفتہ نگاری جو کبھی کبھی میٹھے طنز کا موڑ بھی لے لیتی ہے۔ یہ خالص علی گڑھ کی دین تھی۔ اور مجھے لگتا ہے کہ جس عہد میں عابداللہ سانس لے رہا تھے، اس عہد میں جو چنندہ لکھنے والے خورشید الاسلام اور قاضی عبدالستار بنتے بنتے رہ گئے، (وہ جو کہتے ہیں، ایک آنچ کی کسر رہ گئی)، ان میں اسی نسل میں بس دو تین نام ہی سر بلند ہوتے نظر آتے تھے، جن میں صدیق اور اعجاز کے ساتھ ایک نام عابداللہ غازی بھی تھا۔ تحریر کا ایک آدھ نمونہ بغیر کسی کوشش کے اِدھر سے اُدھر سے زیر تبصرہ Autobiography سے ملاحظہ ہو:

''سید احمد عجیب شخص تھا، جو کچھ کیا قوم کے لئے کیا، جو کچھ مانگا قوم کے لئے مانگا۔ اس کی سوچ اس کا عمل اس کی مانگ بھی کتنی عظیم الشان تھی۔ جیسا وہ قوم کو بنانا چاہتا تھا ویسا ہی علی گڑھ میں عملی نمونہ پیش کر گیا، اس نے تعمیر کی ہر اینٹ میں اپنے

دل کا حصہ رکھ دیا اور اس کی بنیادوں میں اپنا پسینہ، اپنے آنسو اور اپنا خون ڈال دیا''۔

''**میکڈانل** شمشاد بلڈنگ سے متصل تھا۔ (عابد اللہ کے زمانے میں ہاسٹل کا نام غلط تلفظ سے، **میکڈانلڈ** مشہور تھا۔ **شمشاد بلڈنگ** عابد اللہ کے بعد شمشاد مارکیٹ ہوگیا، اب صرف شمشاد ہے، میکڈانلڈ البتہ بہت دن بعد اپنی اصل پر آیا جب ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی پرووسٹی کے زمانے میں ہمارے توجہ دلانے کے بعد یہ اپنے اصل نام کی طرف پلٹ گیا، اور اب یہ میکڈانل ہی ہے: نام کا پتھر البتہ بدخطی کا مثالی نمونہ ہے)۔

''میکڈانل کے سامنے وہ وسیع و عریض میدان تھا جسے ذاکر صاحب اس لان میں ہری ہری گھاس اور پھول لگوا کر اسے گلزار کرنا چاہ رہے تھے، اور وہ یہ کام کر گئے۔ اس لان پر مشہور کرکٹ پویلین اور اس کے متصل اولڈ بوائز لاج تھی/ ہے۔ میکڈانل سے مسجد کے عقبی حصے کا نظارہ اور انگلش ڈپارٹمنٹ کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ سنا تھا کہ کرکٹ کے میدان سے مولانا شوکت علی نے گیند پر ایسا اٹھا مارا جو گنبد کے کلس سے ٹکرا گیا۔ ہمارے دو میں شوکت علی ہوتے تو کرکٹ کھیل کر خلافت تحریک چلا سکتے تھے۔ یہ بات ان کے ڈیل ڈول سے بعید نہیں تھی لیکن ہم نے انھیں کے ڈیل ڈول کے ان کے صاحبزادے مولانا زاہد شوکت علی مدیر، مالک پروپرائٹر روزنامہ خلافت اور مالک متولی مجاور خلافت ہاؤس بمبئی کو قریب سے اور بہت بار دیکھا، وہ جب ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو کوشش کر کے یا احباب کی معاونت سے دوسری کروٹ بیٹھ جاتے تھے۔ البتہ ان کی گفتگو کے چوکے، چھکے اور اٹھے محفل میں ہر سمت چلتے رہتے تھے اور ان کی محفل سے کوئی آزردہ دل بھی بغیر مسکرائے نہیں اٹھتا تھا۔ (ص ۴۰)۔

''میکڈانل ہاسٹل کی تاریخ کا ہمیں علم نہیں لیکن سر سید نے انگریزوں سے جس قدر فائدہ مقاصد کے لیے اٹھایا اتنا ہی انھیں یاد رکھا۔ یوں انھوں نے اسٹریچی ہال اور مختلف بورڈنگوں میں تمام معاونین کے نام کندہ کروا دیے تھے۔ اس عمل سے دوسروں کو ترغیب بھی ہوتی ہے اور معاون کی ہمت افزائی بھی۔ میکڈانل میں تین رویہ ۴۸ کمرے تھے۔ کمرہ نمبر ۱ وارڈن کا تھا۔ اس دور میں نائب وارڈن اشفاق صاحب کے نائب مائے ڈین حمید (شاید محی الدین نام رہا ہوگا) ملیشیا کے رہنے والے مجرد آدمی تھے کمرہ میں خالی بوتلیں اور خالی ڈبے جمع تھے۔ یونیورسٹی کی ہمدردی میں طلبا پر کڑی نگرانی رکھتے تھے، اس لیے طلبا ان کے پریشان کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ طلبا نے ایک بار موسم گرما میں ایک گدھے پر ان کا نام پکی سیاہ روشنائی سے لکھ کر شمشاد بلڈنگ میں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ان کو خبر کی کہ آپ کا کوئی ہم نام شمشاد بلڈنگ میں ٹہل رہا ہے۔ وہاں مشتاقانہ پہنچے تو گدھے سے ملاقات ہوئی۔ اس دور میں کرشن چندر کی ''ایک گدھے کی سرگذشت'' کی کہانی بیسویں صدی میں چل رہی تھی مگر وہ علی گڑھ کی کہانی کہانی نہیں تھی، اصل واقعہ تھا۔ گویا: ع کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے۔ مائے ڈین ماتحتوں کی مدد سے گدھا ہنکا کر یونیورسٹی ٹیوب ویل پر لے گئے اور اسے لکس اور لائف بوئے سوپ سے غسل دے کر قسمت کے لکھے کو مٹا تو نہ سکے اسے دوسرا رنگ دے دیا کہ گدھے اور مائے ڈین کا فرق کچھ واضح ہوگیا''۔

الیکشن کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

''میں بلبلیا اور شفیع قریشی کے الیکشن میں شفیع قریشی کا خاص کنڈکٹر تھا اور اس منظر کا بھی شاہد تھا جس میں بلبلیا پارٹی کی جنازہ پیٹنے والی ٹیم کو ڈنڈوں سے پسپا کر دیا گیا تھا۔ میری نگاہوں میں جنازہ پیٹنا تفریح تھی قابلِ قدر روایت نہیں تھی۔ پہلے الیکشن سینئر لڑاتے تھے اور ان کے لئے جنازہ پٹوانا بھی اتنی ہی بڑا اعزاز تھا جتنا جنازہ پیٹنا۔ اب علی گڑھ کا ماحول سیاسی ہوچکا

تھا اور مقابلہ کمیونسٹ اور اسلامی فورسز میں ہونے لگا تھا۔ اب جنازہ سیاسی حربہ بن گیا تھا"۔

"جس قدر جنازہ پٹنا فخر کی بات تھی اسی قدر پٹوانا بھی بہت بڑا اعزاز تھا۔ جنازہ صرف سینئرس کا پٹتا۔ نوحہ خواں بھی اسی پلے کا سینئر ہوتا۔ صرف سینئرس برآمدے میں کھڑے ہوتے اور جملے کستے، مذاق اڑاتے، مرثیہ پڑھتے۔ ہر جملے پر آہ و بکا بلند ہوتی۔ مرحوم سینئر فخر سے سینہ تانے کرسی پر کھڑا سگریٹ کے کش پر کش لگاتا رہتا۔ پھر سینئر شاعر سامنے آکر اس کا مرثیہ پڑھتا تھا جس پر حاضری سینہ کوبی محرم کے ماتم کی طرح کرتے۔ یہ سلسلہ کافی دیر چلتا۔ چھ سات مرحومین کا ماتم ہوا۔ ان سینئرس میں احمد سعید صاحب کے بھانج داماد پیر جی بھی تھے (بعد میں وہ لکھنؤ میں سائنسی تحقیقات ادارہ سے وابستہ رہے) ان کے مرثیہ کا ایک شعر یاد ہے:

شکست وفتح نصیبوں سے ہے ولے پیرا مقابلہ میرے ممیا سسر نے خوب کیا

ان کا جنازہ خوب خوب پٹا وہ سینئر ور کر بھی تھے اور بھانج داماد بھی۔ جن کے جنازے پٹ جاتے وہ دوسرے دن فخر سے سینہ پھلا کر یونیورسٹی میں گھومتے اور جونیرس کو چائے پلا کر اپنی بزرگی کی تصدیق کراتے۔ پیر جی کی سینئرٹی کا شرف آج تک باقی ہے"۔

"اکتوبر ۱۵/ لیاقت علی خاں کی شہادت کی خبر ملی۔ وہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے۔ ان کی فریم کی ہوئی تصویر اسٹوڈنٹس یونین میں آویزاں تھی۔ یوں بھی علی گڑھ میں پاکستان سے ہمدردی رکھنے والا طبقہ اس وقت خاصا موجود تھا۔ بہت سے طلباء نے چھٹی کا سائرن بجانے کا اور یونین میں تعزیتی جلسے کا مطالبہ کر دیا۔ علی گڑھ میں روایت تھی کہ شب کو معمولاً ۸ بجے سائرن بجتا تھا اور اگر کوئی موت ہو یا خاص واقعہ ہو تو فوراً سائرن بجا کر اس کا اعلان ہو جاتا تھا۔ لیکن لیاقت علی خاں کی شہادت سے چند ہفتے قبل یونیورسٹی ایکزیکیٹو نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی کی موت پر سائرن نہیں بجوایا جائے گا۔ اس فیصلہ کے فوراً بعد اتفاق سے لیاقت علی خاں کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔ احمد سعید کی قیادت میں طلباء نے سائرن بجانے کا پرزور مطالبہ کیا۔ ادھر یونین کی طرف سے تعزیتی جلسے کا اعلان ہو گیا اور اگلے دن اس سوگ میں علی گڑھ کی سوگواری کی روایت کے طابق ایک دن کی چھٹی کے مطالبے نے بھی زور پکڑا۔ اس وقت کے سیاسی حالات میں طلباء کا جوش اور احمد سعید کی قیادت یونیورسٹی کے لئے نئے مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ وقت کی نزاکت کے پیش نظر ذاکر صاحب پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔

"شام کو یونین کی گھنٹی تعزیتی میٹنگ کے لئے بجی تو جوق در جوق طلباء یونین کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس روز جونیر ہونے کے سبب ہمیں نہ اس گھنٹی کی خبر ہوئی اور نہ اس میٹنگ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس معاملے کی کام ریڈ پلاننگ بھی ہمارے کمرے پر نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیا کہ پوری یونیورسٹی میں آزردگی اور سراسیمگی کی فضا تھی۔ مسٹر جناح کے بعد لیاقت علی خاں کی شہادت دونوں ملکوں اور مسلمانوں کے لئے سانحہ تھی۔ پورے ماحول میں غیر یقینی کا ماحول تھا۔ لیاقت علی خاں پاکستان کے کچھ بھی ہوں وہ علی گڑھ کے مایہ ناز فرزند تھے۔

"میٹنگ کے بعد جب لوگ لوٹے تو معلوم ہوا کہ وہاں کتنا بڑا ہنگامہ ہوا۔ احمد سعید صاحب نے اپنی تقریر میں سائرن بجانے اور اگلے روز چھٹی کو اسلام، مسلمان، اردو یونیورسٹی اور علی گڑھ کی عظیم روایات سے اس طرح ملایا کہ وہاں کسی اور کے لئے دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب بمشکل یونیورسٹی کے فیصلہ کی اہمیت اور اسے بدلنے کے عواقب کو سمجھا سکے۔ لیکن وہاں سننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ پھر بھی ذاکر صاحب نے جمہوری اقدار کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ہمیں اس مسئلہ پر سب کی بات سن کر جمہوری فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس لئے انھوں نے صاحب صدر شبیہ الحسن نونہروی سے فرمایا اس مسئلہ پر جن لوگوں کو اظہار خیال کرنا ہے ان کو دعوت اظہار خیال دیں۔ تو نہروی صاحب نے اس بات کا اعلان کیا۔ وہاں ہر تقریر سائرن بجانے کی تائید میں

تھی۔ کسی کامریڈ کو بھی مخالفت کی جرأت نہ تھی لیکن ایک جیالہ جامعی نوجوان رضی الدین نے ہمت کر کے، یا حماقت کر کے، اپنا دایاں ہاتھ اٹھا دیا اور انھیں تو نہروی صاحب نے دعوت دی کہ وہ اظہار خیال فرمائیں۔ وہ تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر آئے لیکن انھوں نے سائرن نہ بجانے کی تائید کی۔ جیسے ہی طلبا کو ان کے خیالات کا علم ہوا ایک ہنگامہ ہو گیا اور اسٹیج پر جو لوگ نزدیک تھے انھوں نے ان پر بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر دھاوا بول دیا اور وہ اسٹیج سے اس عالم میں اترے کہ ع ''سر بدستِ دگرے دست بدست دگرے'' ذاکر صاحب کی پٹھانیت کو جوش آ گیا اور انھوں نے فرمایا: ''اگر اسی طرح آپ جمہوریت کو برتیں گے تو نہ اس میں مسلمانوں کا کوئی مقام ہوگا نہ اس ملک میں کوئی پوچھے گا۔ قدرت نے آپ کو جو مواقع دیئے ہیں اگر آپ ان کا جائز استعمال نہیں کریں گے اور اپنے جذبات پر غالب نہ آ سکیں گے تو مواقع ضائع ہو جائیں گے اور حالات آپ پر غالب آ جائیں گے''۔

اور پھر انھوں نے صدر صاحب سے فرمایا: ''آپ اعلان کر دیجئے اگر غم منانے کا واحد طریقہ سائرن بجانا ہے تو جائیں اور سائرن بجائیں۔ اور اگر قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کرنا اور مرحوم کی خدمات کو مشعل راہ بنانا ہے تو اس میں وقت لگائیں۔

''طلباء نے صاحب صدر کے اعلان کا انتظار نہ کیا۔ انہوں نے اول الذکر کو آخر الذکر، عاجلہ کو آخرہ پر ترجیح دی۔ اور وہاں سے سرسید ہال پہنچ کر خود ہی سائرن آن کر دیا۔ اس کی آواز رات بھر وقفہ وقفہ سے علی گڑھ کی فضاؤں میں گونجتی رہی۔ اس کی آواز سے طلباء میں رت جگے کا سا سماں رہا اور زندہ تو زندہ مثنوای کی خوابیدہ روح کی نیند بھی چونک اٹھی۔ یونین سے جب طلباء لوٹے تو اس وقت کے بعد ہفتوں ذکر رہا کہ کس نے کیا رول اس اہم تاریخی فیصلہ میں ادا کیا۔

''رضی الدین صاحب نظیر اکبر آبادی پر شعبہ اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ جامعہ ملیہ کے گریجویٹ تھے۔ پہلے نیشلسٹ تھے پھر ترقی کر کے کامریڈ ہو گئے تھے۔ لمبی اور مسلسل گفتگو کے عادی تھے۔ تقریر سے زیادہ تحریر میں رواں تھے۔ وہ دو جملوں کی بات کو کئی سو صفحات میں لکھ دینے پر قادر تھے اور اپنی اس قدرت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ جامعہ کی قوم پرست چھوٹی سی درسگاہ سے علی گڑھ آئے جو پاکستان بنانے والی قوم کا آخری گڑھ تھا اور ذاکر صاحب کی محبت میں وہ بے خطر جذبات کی آگ میں کود پڑے۔ ان کی اعلیٰ ظرفی کا یہ عالم تھا کہ اتنے زدوکوب کو انھوں نے ہلکی پھلکی تنبیہ سمجھا اور گاندھی جی کی اہنسا کے اس سنچا لک نے قوم کو معاف کر دیا۔

''یونین پلیٹ فارم ایسی تجربہ گاہ تھا جس کے صحیح استعمال سے قوم پرست ہندوستانی جمہوریت میں مؤثر شرکت کے دروازے کھل سکتے تھے۔ لیکن افسوس ہے، یونین کے رہنماؤں نے ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں نہ کوئی مثبت کردار ادا کیا نہ جمہوریت کی آبیاری کی اور نہ کسی پائیدار کام کی بنیاد ڈالی۔ البتہ ایک بہت اہم اور مثبت کام علی گڑھ کے کھنڈروں نے کراچی میں کر ڈالا جہاں ظل نظامی اور ذاکر علی خاں کی قیادت میں انھوں نے ہنستے کھیلتے ایک عظیم ادارہ رشک علی گڑھ سرسید یونیورسٹی قائم کر دی اور اس کے ساتھ متعدد ذیلی تعلیمی ادارے، شادی لان، علی گڑھ اولڈ بوائز کلب۔ علی گڑھ اولڈ بوائز جو سالانہ سرسید ڈے ڈنر کرتے ہیں کراچی جا کر سرسید یونیورسٹی دیکھیں اور وہاں کے اولڈ بوائز سے جوان رہنے، قہقہے لگانے اور کام کرنے کا سلیقہ سیکھیں۔ میں جب کراچی جاتا ہوں وہاں اپنے خالی کاسہ کو قہقہوں، شعروں، تعمیری خیالوں، عملی پلانوں سے بھر لاتا ہوں اور پھر انہیں دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہوں۔ جب دینے والوں کو دینے میں خست نہیں تو ہم کون ہیں کہ اسے سینت سینت کر رکھیں؟۔

''الیکشن کے زور میں احمد سعید کی جناح کیپ اور ''اسلام خطرے میں ہے'' کی سیاست یونیورسٹی کے توازن پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب شاید احمد سعید کو سبق دینا چاہتے ہوں، ہر چند کہ وہ جامعہ کے زمانے سے ذاکر صاحب کے چہیتے

شاگرد تھے۔غرض ذاکر صاحب نے اسٹریچی ہال میں ایک ایمرجنسی میٹنگ بلائی اور پندرہ منٹ انگریزی میں بہت موثر تقریر کی۔بعض جملے میری اپنی کمزور انگریزی کے باوجود سمجھ میں آئے۔جس میں انھوں نے کہا تھا'' کہ تم میرے لئے اولاد ہو لیکن جب اولاد غلطی کرتی ہے تو والدین کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ تربیت کریں، تنبیہ کریں اور اگر اس کا اثر نہ ہو تو سزا دیں۔میں سزا کا قائل نہیں۔لیکن جب میں سزا دیتا ہوں تو وہ بہت سخت ہوتی ہے۔اور میں فیصلہ کر کے اسے واپس نہیں لیتا''۔طلباء پر سکوت طاری تھا اس سکوت کو احمد سعید کے پوائنٹ آف آرڈر نے توڑا۔ذاکر صاحب نے میٹنگ برخواست کر دی۔طلباء میں اب ہر سو چرچا تھا کہ دیکھو کس کو کیا سزا ملتی ہے۔کسی کو کوئی سزا نہ ملی لیکن اس تقریر نے احمد سعید کا طلسم توڑ دیا۔

''اس الیکشن میں خلاف امید شاہ عنایت حسین آفتاب کامیاب ہو گئے۔یونین کی روایت کے مطابق گنتی کے بعد یونین کی چھت سے مائکروفون پر اعلان ہوتا تھا لیکن امیدواروں کے نمائندوں نے پہلے سے اشارے کنائے طے کر رکھے تھے اس لئے خاص خاص لوگوں کو نتیجہ کی خبر ہو گئی تھی اور دونوں کیمپوں میں اگلے مرحلے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ہم لوگ یونین کے لان میں کھڑے ہوئے ووٹ کاؤنٹ کرنے والوں کا انتظار کر رہے تھے۔بالآخر اعلان ہوئے اور ہر اعلان پر تالیاں گونجتیں اور شور بلند ہوتا۔علی گڑھ میں اس دور میں خوشی کے موقعہ پر تالیاں بجائی جاتی تھیں اور نعرہ تکبیر نہیں لگایا جاتا تھا۔امریکہ آکر معلوم ہوا کہ تالیاں بجانا حرام ہے اور نعرۂ تکبیر فرض۔چونکہ ہر خوشی کے موقعہ پر نعرۂ تکبیر مناسب نہیں اس لئے امریکن مسلمانوں کے جلسہ میں نہ تالیاں بجتی ہیں نہ نعرے لگتے ہیں۔سوگ کا سا سنجیدہ ماحول رہتا ہے جسے اکثر دیندار لوگ اسلامی ماحول کہتے ہیں۔علی گڑھ کی ہر محفل اس سنجیدگی کی ضد تھی جو ہم پر اسلام کے نام پر امریکہ میں نافذ ہے۔وہاں تو اسلام پسند حضرات تک، عبدالحق انصاری جیسے ثقہ لوگوں کو چھوڑ کر، موقع و محل سے بے ساختہ مسکرا دیتے تھے۔یوں علی گڑھ کی زندگی ایک مسلسل قہقہہ تھی جو زندگی سے بھرپور تھا۔

''اس زمانے میں فرنگی کپڑے کبھی کبھار پہنتا تھا۔کچھ عرصے بعد مجھے دہلی کا سفر درپیش تھا۔میں نے ابن احسن کے پینٹ اور بش شرٹ کو صندوق سے نکال کر ٹرائی کیا تو ایسا لگا جیسے یہ جوڑا میرے ہی لیے بنا تھا علی گڑھ میں میرا وزن سو پاؤنڈ تھا اس لئے اکثر صحتمند دوستوں کے کپڑے میرے جسم پر فٹ نہیں آتے تھے۔لیکن ابن حسن خود قد و قامت اور وزن اور ڈیل ڈول میں میرے قریب قریب تھے۔میں نے پینٹ اور بش شرٹ زیب تن کر کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا پھر آئینہ کو جسم کے مختلف حصوں کے روبرو کر کے خود کو دیکھا تو بہت اچھا لگا۔پھر میں دلی کے لیے روانہ ہو گیا۔علی گڑھ کے اسٹیشن پر میں دلی کی ٹرین کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک نوجوان نے آکر مجھے غازی جی کہہ کر ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔میں نے تعارف چاہا تو فرمایا 'وہ شری ابن حسن جی کے مِتر ہیں، وہ علی گڑھ میں اکثر ان کے گھر براجمان ہوتے ہیں'۔میں نے پوچھا آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟ انہوں نے فرمایا: 'شری ابن حسن جی آپ کی بہت تعریف کرتے تھے'۔لیکن آپ نے یہ کیسے پہچانا کہ میں ہی غازی ہوں؟'۔'یہ سوٹ جو آپ نے پہن رکھا ہے وہ میرا ہے'۔یہ کہہ کر وہ دوست ہنس دیا اور مجھے بھی قہقہہ کا دورہ پڑ گیا۔پھر میں نے سنبھل کر معذرت آمیز لہجے میں کہا: 'یہ کپڑے ابن حسن میرے کمرے پر چھوڑ گئے تھے اور وہ میرا کرتا پاجامہ اور شیروانی پہن کر رخصت ہو گئے تھے'۔بولے: 'آپ کا کرتا پاجامہ اور شیروانی میرے پاس دھلا رکھا ہے، وہ میرے روم پارٹنر میش کا کرتا پاجامہ پہن کر لکھنؤ چلے گئے'۔میں نے عرض کیا: 'اس وقت آپ کے کپڑے میں آپ کے حوالے نہیں کر سکتا، نہ ہی اپنے کپڑے آپ سے وصول کر سکتا ہوں'۔دوست نے ہاتھ جوڑ کر بڑی نمرتا سے کہا: 'جو کپڑے آپ پہنے ہیں وہ بھی آپ کے ہیں اور جو میرے

پاس ہیں وہ بھی آپ کے ہیں'۔ ہم دونوں نے دلی سے واپسی کے بعد کپڑے تبدیل کر لیے"۔

●

کتاب کے دو نام ہیں، ایک جہد مسلسل، دوسرا "علی گڑھ سے علی گڑھ تک" کتابوں کے نام بعد میں آنے والے کئی بار دوہرا دیتے ہیں، ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی ماخذ (مثلاً مرزا غالب) سے نام لے لیا جاتا ہے، دوسری وجہ یہ بھی ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے کہ وہ ترکیب یا وہ الفاظ کا دروبست بے اختیار اچھا لگنے لگیں، تیسری وجہ لاعلمی بھی ہو سکتی ہے کہ پیشرو ٹائٹل اگرچہ چھپ چکا ہے لیکن بعد میں نام رکھنے والے کے علم میں نہیں آیا : پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی کتاب "آئینہ خانہ میں"، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب اسی ٹائٹل سے مدتوں قبل، 1950ء میں شائع ہو چکی تھی! عصمت چغتائی کی آٹو بایوگرافی کا نام، خلیل الرحمٰن اعظمی سے مستفاد ہے۔

ٹھیک ہی ہے۔ اب راہل نام کے اس وقت 136 افراد تو بڑی آسانی سے مل جائیں گے، نریندر نام کے 266، حتیٰ کہ ابھی ہمارے ایک بڑے شاعر علی گڑھ کے مرحوم نیرج بھائی کا ذکر تھا، ایک کھلاڑی، نریندر نام، پرسوں کے اخبار میں سامنے آگیا: زبردست کھلاڑی جس نے پوری دنیا میں نام پیدا کر لیا۔

ٹائٹل/ناموں کے رجسٹریشن کرانے کا کوئی سلسلہ چلا ہی نہیں ہے : حتی کہ فلموں میں بھی پرانے نام اپنا لیے جاتے ہیں (دیوداس تین بار؛ رامانند ساگر کا آرزو 1965، اور مادھوری دکشت کا 1999 میں)۔ تو کوئی حرج نہیں : بلکہ ایک مثال تو ایسی زبردست ہے کہ باید و شاید۔ سرور صاحب کی کتاب بہ نام "نئے اور پرانے چراغ" 1946ء کے آس پاس شائع ہوئی تھی، ادبی تنقید کی صنف میں یہ اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اب، جناب، 1966ء کے آس پاس یہی ٹائٹل پھر نظر آ جاتا ہے، اور اس کے صفحہ اولیں پر یہ عبارت :

> "ہمارے یہاں اردو میں یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی کہ دو چار سال میں یا دس بیس برس بعد کسی پیشرو کتاب کا نام چرا لیا جائے، اسی طرح کی یہ **چوری** میں نے بھی کی ہے: مگر ایک فرق کے ساتھ؛ یہ دراصل اعتراف ہے اس فیضان کا جو اردو تنقید کی مشہور کتاب **نئے اور پرانے چراغ** سے مجھے پہنچا ہے۔ کتاب کو پڑھے اٹھارہ بیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے، مگر اس کے مضامین نے ذہن کو اس درجہ سحر زدہ سا کر دیا تھا کہ جب سے یہ نام برابر مجھے ہانٹ کرتا رہا ہے؛ جیسے کوئی دلآویز خوشبو، کوئی خوبصورت یاد، کوئی بے غرض نیکی، کوئی بے میل خلوص۔ اور میں یہ نام اپنی اس کتاب پر ثبت کر کے اپنے ذہن کو اس کی مستقل زد میں رہنے سے بچا لے جانا چاہتا ہوں"۔

عبارت پڑھ کے جو عنوان کے پہلے مالک (سرور صاحب) کا ردعمل تھا، وہ یاد آتا رہتا ہے سرور صاحب اس عبارت میں وارد "چوری" پڑھ کے کہنے لگے "یہ چوری نہیں یہ تو سینہ زوری ہے، ڈاکا ہے، ہمارے یہاں بدایوں میں تو ایک خاندان یا ایک محلہ میں بھی کسی نام کی تکرار سے لوگ برا مانتے تھے"۔

عابد اللہ غازی کی کتاب کے دو ٹائٹل ہیں ایک جہد مسلسل، دوسرا علی گڑھ سے علی گڑھ تک۔ کہنا یہ تھا کہ پہلا نام تو پہلے پہل سید حامد کو پسند آیا تھا، یعنی حکیم عبدالحمید کے بارے میں سید حامد کی تحریر کا عنوان۔ دوسرا نام اطہر پرویز نے اپنی

کتاب کا رکھا تھا ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک''۔ میرے خیال میں کوئی حرج نہیں ہے اگر یہ ایک ہی نام دونوں کتابوں پر ثبت پایا جائے، کیوں کہ یہ کہانی جہد مسلسل کی بھی ہے اور موضوع ایسا ہی ہے جسے علی گڑھ سے علی گڑھ تک ہی کہا جا سکتا ہے۔

کتاب پر مصنف کا نام ''ڈاکٹر عابد اللہ الانصاری غازی (علیگ)'' ہے۔ باپ کا نام بھی حامد الانصاری غازی لکھا جاتا ہے، انھیں خود اس طرح لکھنا پسند تھا، لیکن علی گڑھ کے بارے میں کتاب پر یہ نام انصاری یا الانصاری اضافہ کہاں تک جائز ہوگا، یہ نظر ثانی کا محتاج ہے؛ علی گڑھ میں تو یہ صرف عابد اللہ غازی تھے، باپ یا پردادا بھلے ہی انصاری رہے ہوں!

عابد اللہ کا زمانہ وہ **تھا** جب پانچ سات سال بعد ہندستان کا ہونے والا اُپ راشٹریہ پتی اور پھر راشٹریہ پتی ہمارا وائس چانسلر تھا،

زمانہ وہ تھا جب آگے چل کے ہونے والا، نائب صدر جمہوریہ، آفتاب میں ہمارا ہاسٹل فیلو تھا،

زمانہ وہ تھا جب اسٹوڈینس یونین کا صدر ہم لوگوں کی نظروں میں انڈین یونین کے صدر جمہوریہ کا درجہ رکھتا تھا؛ وہ خود بھی یہی سمجھتا ہوتا تھا!

زمانہ وہ تھا جب اعجاز احمد (جغرافیہ)، اشتیاق محمد خاں (علی گڑھ ترانہ والے)، رامپور کے عرشی زادہ اکبر علی خاں، رفیع اللہ خاں عنایتی عرفان اللہ خاں، باقر علی خاں، ظہیر احمد، محمد آباد گہنہ کے نسیم فاروقی اور الہ آباد کے ہاشم میکڈانل ہاسٹل کے بورڈر تھے۔ کل کے، ۱۹۰۳ء کے، میکڈانل کے عبید الرحمٰن خاں شروانی اور قاضی عبدالودود، آج کے ۱۹۵۳ء کے علی گڑھ میں عابد اللہ اور عابد رضا بیدار میں جنم لے چکے تھے۔ میکڈانل کی اپنی دنیا آپ تھی، جس کی پرسکون فضا میں کبھی کبھی طوفان آجاتا تا جب ہم میں سے کوئی یونین کے الیکشن میں کود پڑتا۔

عابد اللہ کا قصہ یہیں سے چھڑتا ہے، جس کے نام کے آخر میں غازی لگا دیکھ کر ہم سب مرعوب ہو جاتے: خالی خولی عابد اللہ میں کیا رکھا تھا مگر غازی لگ کے تو بات ہی کچھ اور ہوگئی تھی! کچھ بھاری بھرکم نام کا فیض، اور کچھ پالنے ہی میں پاؤں بھی نظر آنے لگے تھے: میاں عابد اللہ چل پڑے! اور پھر، انڈر گریجویٹ ہوتے ہوئے بھی، اپنی تقریروں کے بل پہ جلد ہی علی گڑھ ہی کی یونین کے اسٹیج کے بڑوں میں ہی نہیں، ہندستان گیر پیمانہ پر ایک بڑے مقرر کی حیثیت سے اپنا جھنڈا پھہرانے لگے، اور پھر ابھی چار چھ سال بھی نہیں گذرے تھے کہ پہلے علی گڑھ اور پھر پورے ہندستان کی اسٹوڈینٹس یونین کے سربراہ منتخب ہوگئے۔

علی گڑھ یونین کے اسٹیج پر جو مقرر چمک گیا وہ پھر ساری زندگی نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا: طلبہ کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی تھی کہ طالب علم پڑھائی میں کیسا ہے؛ گھر کا کھاتا پیتا ہے یا بس کام چلتا ہے: عیار تھا تو بس اتنا کہ یونین میں تقریر کیسی کر لیتا ہے۔ یونین کے اسٹیج پہ جو کامراں نکل گیا، بس وہ طلبہ کا ہیرو بن جاتا تھا! اور پھر سب سے اچھا مقرر دیکھتے دیکھتے یونین کا صدر منتخب ہو جاتا تھا۔ پہلی بار عابد اللہ نے کفر توڑا تھا: ایک انڈر گریجویٹ، یونین کے الیکشن میں مقابلہ

کے لیے میدان میں اتر آیا تھا۔میکڈانل ہاؤس علی گڑھ کے میدان کارزار کی راجدھانی بن گیا تھا اور ایک دو مہینے کے لئے پڑھائی لکھائی لپیٹ کے ہم سب اسی میں جٹ گئے تھے۔ابھی تو یہ سکریٹری کا الیکشن تھا، اور آگے چلنا باقی تھا۔

ادھر الیکشن لڑتا ہوتا؛ ادھر متوازی طور سے اشتیاق محمد خاں کی علی گڑھ ترانے کی دھن بنتی ہوتی، ہمارے استاد ڈاکٹر مقبول آکسفورڈ سے تازہ وارد، اسلامک اسٹڈیز کے ریڈر/ پروفیسر مسلمانوں کی سائنسی خدمات اور خاص کر عرب جغرافیہ دانوں پر اتھاریٹی (جو آگے چل کر ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے بانی ڈائریکٹر ہوئے) ہارمونیم کے شوقین تھے، اشتیاق محمد خاں کا شوق اپنے سے فزوں تر دیکھا تو علی گڑھ ترانے کی دھن بنانے کی خاطر اپنا باجا، خان صاحب کو وقف کر دیا۔

ایک دن میکڈانل ہاؤس سے شور اٹھا، کسی نے نعرہ لگایا، ترانہ مکمل ہو گیا۔ پہلے گھر والوں (میکڈانل ہاؤس) نے پاس کیا، پھر ذاکر صاحب نے سنا اور مست ہو گئے۔یوم آزادی تھا یا یوم جمہوریہ، وکٹوریہ گیٹ کی مختصر مگر بلند و بالا گھنی سایہ دار غلام گردش کے تلے اشتیاق محمد خاں اور ان کی مختصر سی ٹیم ہارمونیم کو گھیرے کھڑی تھی، دوسری طرف ذاکر صاحب اور ان کے سینئر رفیق، تیسری طرف ہم سب گھیرا باندھے باادب ایستادہ تھے، ذاکر صاحب آزاد ہندستان کے آزاد علی گڑھ کے طلبا کو خطاب کر رہے تھے: آزادی ہر روز حاصل کی جاتی ہے، اگر تم اس کو سنبھال کر نہ رکھ سکو تو کھوئی بھی جا سکتی ہے، اس کے لئے ہمارے بڑوں نے بہت قربانیاں دی ہیں، اسے باقی رکھنا ہے تو محنت کرنا ہوگی ورنہ اسے گنوا دو گے۔مشکل سے تین چار منٹ کی تقریر تھی، جب ختم ہوئی تو یکا یک ہارمونیم وہ دھن بکھیرنے لگا جو ہزار بار سنی ہے اور مست ہو ہو گئے ہیں، مگر اس پہلی بار کے سننے کا نشہ ہی اور تھا۔اور ذاکر صاحب بھی ہم سے کچھ کم سرشار نہ تھے۔غضب کا سماں تھا، لمحات جیسے ٹھہر گئے تھے، وکٹوریہ گیٹ سے اتر کے اسٹریچی ہال تک کھڑے ہوئے تن آور درخت ساکت و صامت، جیسے کان لگائے سن رہے ہوں، سامنے اسٹریچی ہال، جیسے مست و مبہوت کھڑا تھا! ایک اُور لٹن لائبریری دوسری اُور ایم اے او کالج/ مسلم یونیورسٹی کی البیلی مسجد! ادھر ہم سب وکٹوریہ گیٹ کے سائے میں، پھر نیچے بھی دور تک پھیلے ہوئے، سید کے اس عظیم فرزند ساتھ کھڑے ابھی ابھی وہ مست و بیخود کر دینے والا ترانہ سن رہے تھے! پہلی بار سنا تھا، بات ہی کچھ اور تھی: مبہوت اور سرشار! یکا یک سب ایک خواب سے جاگ گئے، بس ایسا ہی لگتا تھا جیسے ابھی چند لمحے پہلے ایک طویل نیند میں ایک بہت ہی شیریں نغمہ ہمیں ایسی کیفیتوں میں چھوڑ گیا تھا جیسا تجربہ پھر کبھی نہ ہوا، ذاکر صاحب نے اشتیاق محمد خاں کی پیٹھ تھپتھپائی، پھر ہم سب بھی اپنی اپنی پیٹھ تھپتھپاتے ہاسٹل کی طرف چل پڑے، راستہ بھر نغمہ کانوں میں گونجتا رہا: یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں! (اور پھر) : یہ ابر ہمیشہ اٹھا ہے، یہ ابر ہمیشہ اٹھے گا، جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا، برسے گا، برسے گا، برسے گا!!!

ذاکر صاحب کے ہوتے، علی گڑھ پوری دنیا کی راجدھانی لگتا تھا اور آئے دن رشید صاحب کے قول کی تصدیق ہوتی جاتی تھی کہ دنیا کا بڑے سے بڑا آدمی ہمارے یہاں وزٹ کرتا تو ہمیں اطمینان ہوتا کہ ہمارے پاس اس سے بھی بڑا آدمی ہے، آنے والے پر ہم یونین کی چھت سے پھولوں کی برکھا کر کے اس کے ہوش و حواس کچھ دیر کے لئے معطل کر

دیتے، ایسا خوش ہوتا جیسے دنیا کی ساری دولت، ساری خوشیاں اسے مل گئی ہوں۔ یونین کے اسٹیج سے ہمیں خطاب کرتا اور ہم اس کی باتوں سے خوب فیضیاب ہوتے۔ پھر ہمارا بڑا آدمی کھڑا ہوتا اور ہم پورے یقین کے ساتھ اسے سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوجاتے کہ سب سے بڑا آدمی تو خود ہمارے پاس موجود ہے۔ ذاکر صاحب بولتے اور ہم سنتے رہتے، بس ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، ذاکر صاحب کے لئے رشید صاحب کا جملہ کانوں میں گونجتا رہتا اور ہم سب کہتے جاتے : ہمارا آدمی آج بھی آنے والے سے آگے نکل گیا، آخر ہم تو ہم ہی ہیں!

عابداللہ غازی کے اور ہمارے زمانے میں ہم سب کے لئے ذاکر صاحب سے بڑا انسپریشن کوئی نہ تھا، یونین میں، وکٹوریہ گیٹ پر، اسٹریچی ہال میں، اور پھر چھوٹے بڑے جلسوں میں ہفتے دو ہفتے بعد انھیں سننے کا موقع ملتا رہتا۔ اور جب بھی سنتے ہمیں اپنا قد پہلے سے زیادہ بڑا لگنے لگتا، اس خاص انسپریشن کا ایک عجیب اور 'خطرناک' پہلو یہ تھا کہ ہم میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہوتا کہ پورے ہندستان کی قیادت تو بس ہمیں ہی کرنا ہے: اب تعلیم سے فارغ ہوئے، اب کارزارِ حیات میں اترے، اور اب دنیا نے ہمارے لئے آنکھیں بچھائیں، اب ہمیں بڑائی کا تاج پہنایا! ہماری سوچ میں دور دور تک کوئی ملاوٹ نہ تھی، ہمارا معیار تو بس رابعہ بصری تھیں! نہ دوزخ کے ڈر کی ملاوٹ، نہ جنت کی آسائش کا لالچ! بس کچھ تھا تو یہ کہ اللہ کے لئے اور اس کے بندوں کے لئے کچھ کر جانا ہے اور کچھ کر کے جانا ہے، چاروں طرف دکھ ہی دکھ ہیں، دکھیاروں کے کچھ دکھ تو اپنی سکت بھر سمیٹ ہی لیں، شیوجی کو اکیلا کیسے چھوڑ رکھیں، چاروں اور بکھرا زہر تو، جتنی سکت ہو سکے، مَتھ کے پینا ہی ہے، علی گڑھ نے تو بس ہمیں یہی سکھایا تھا۔ کبھی یہ نہ سوچا کہ وائس چانسلر بن جائیں، نہ کبھی وزیر اعظم ہی بن جائیں، گورنر ہو جائیں۔ بس خیال آتا تو صرف اتنا کہ کچھ کر جاؤ، اپنے کو بھول کر دوسروں کے لئے کچھ کر جاؤ! اپنے لئے تو اللہ کی ساری مخلوق جیتی ہے، بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، سارے چرندے، سارے پرندے: جیتے ہیں، بچوں کو پالتے ہیں پھر اپنی اپنی انتم انجان گذرگاہوں پر چلے جاتے ہیں، ہمارا اشرف کیا ہوا، آدمی سے انسان بننے کی کتنی منزلیں ہم طے کر پائے!

عابداللہ کے اور ہمارے عہد کے ہر طالب علم کے دل میں ذاکر صاحب ایسی گیرائی اور گہرائی سے جاگزین ہو پڑے تھے جیسے ہمارے جسم و جاں کا ایک حصہ بن گئے ہوں۔ یہ جب تو تھا ہی، جب وہ ہم سے ہر ساعت قریب تھے اور ہم جب چاہتے ان سے مل لیتے، بات کر لیتے؛ کہنے کی بات یہ ہے کہ آج بھی ہر ایسے لمحہ میں، جب انسپریشن کی ضرورت پڑتی ہے تو دل میں بسی ہوئی ایک انمٹ تصویر ابھر کے آجاتی ہے، اور ہم سے اسی خوشدلی، خوشگواری، خوش اطواری اور خوش نگاہی کے ساتھ، کچھ نہ بولتے ہوئے بھی مستقل سرگوشی کرتی رہتی ہے، اور چلتے چلتے ہر بار بس ایک پیغام چھوڑ جاتی ہے: کچھ کر جانا! اپنے لئے نہیں، دوسروں کے لئے کچھ کر جانا!! یہ خدا کا راستہ ہے، خدارس بھی، خدارساں بھی! صوفیوں کا تصورِ شیخ کچھ اسی قسم کی بات ہوتی ہوگی!

عابداللہ کے ساتھ ہم سب وہاں کھڑے تھے: ۱۹۵۳ سے ۱۹۵۹ تک : اعجاز بھی، مجاز بھی، مجاز ترانے کے نغمہ ساز اشتیاق محمد خاں بھی: ہم سب آج بھی وہیں کھڑے ہیں، ذاکر صاحب کے فیضان کے مارے ہوئے! اعجاز جا چکا(

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کا ممتاز پروفیسر، دنیا کے بڑے جغرافیہ دانوں میں جس کا شمار ہوتا ہے۔ لاہور کے **نصرت** اور **سویرا** میں، امین اشرف/قمر رئیس کے علی گڑھ میگزین میں، احمد رشید شروانی کے ''دوست'' میں، اور خود اپنے اخبار **علیگ** میں اعجاز کے قلم نے کیا کیا ہنگامے مچائے! نظموں کا شاعر بھی بڑا منچلا تھا، اور نثر لکھنے کا اسٹائل تو ایسا غضب کا تھا کہ خورشید الاسلام کے بعد اس نسل کے ہمعصروں میں بس دو تین ہی نام ابھرتے نظر آرہے تھے جو اس عمر میں بھی صاحب طرز یا اسٹائلسٹ معلوم ہونے لگے تھے۔ پھر اعجاز جیوگرافی میں کھو گئے، عابد اللہ امریکا میں، اور صدیق (الرحمٰن قدوائی) ہنگامہ زادتی میں: ہمارے تین صاحب طرز ہم سے چھن گئے)۔

عابد اللہ کے کمرے میں جس ترانے کی دھن بنتی تھی اس ترانے کے خالق اشتیاق محمد خاں بھی جا چکے، مگر کیا تحفہ دے گیا وہ شخص علی گڑھ والوں کو: علی گڑھ، اور ساری دنیا میں بکھری ہوئی علیگ برادری یہاں وہاں ہر سو، جب چاہیں اس دھن کو سن کے تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی ایسے کھو جاتے ہیں جیسے ان چند لمحوں میں اس دھن کو کانوں میں رس گھولتے رہنے کے سوا دنیا میں کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

عابد اللہ کے الیکشن کے اصل مہم جُو، عرفان اللہ خان (جو ارونا آصف علی کے ساتھ **لنک** اور **پیٹریاٹ** میں جرنلزم کرتے رہے، پھر دلی سے بمبئی شفٹ کر گئے اور کرنجیا، کراکا، ایوب سید سب کے جرنلزم کے ساجھی بنتے رہے؛ پھر ہندستان لیورس؛ پھر جیٹلی، بمبئی سے دلی اور دلی سے بمبئی اور پھر دو سال تک کینسر سے لڑائی: عرفان ہار گیا، کینسر جیت گیا، ظہیر صاحب نے چوبیس جنوری کے ٹائمز آف انڈیا کے تعزیت ناموں کے ذیل میں یہ خبر سنائی تھی تو دل دھک سے رہ گیا تھا۔ بڑا جرنلسٹ ہو جاتا مگر بہت سے ادھورے وعدوں کی طرح شرمندہ تعبیر نہ ہو پایا! بڑی اہلیت تھی، بے حد صلاحیت تھی، بڑی جرأت مندی تھی، زندگی سے اتنا بھرپور، سراپا اضطراب: مگر پھر سب کچھ اختر الایمان کے **وقت** کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا!

عابد اللہ کی آٹو بایوگرافی پڑھتے پڑھتے خیال کی رو متوازی طور سے بہنے لگی، ایسی کہ عابد اللہ غائب! بس میکڈانل ہاؤس رہ گیا، ذاکر صاحب رہ گئے اور ذاکر صاحب کا وہ علی گڑھ جو اسی طرح اسی انسپریشن کے ساتھ مہمیز دیتا رہتا ہے، کہ کچھ کر جاؤ اس سے پہلے کہ آخری لمحہ آجائے! عابد اللہ نے اپنی سکت بھر بہت کچھ کیا، باقی بہت کچھ کرنے کی آرزو لیے شکاگو کے کسی پُر آسائش مکان میں استراحت پذیر مجھ سے سرگوشی کرتا ہوتا ہے کہ پہلے تم جاؤ گے یا میں۔ اور میں دل ہی دل میں ہنس کے کہتا ہوتا ہوں ساتھ ہی چلیں گے بھائی، مگر کچھ بہتر تو ہو لو کہ **ساتھ ساتھ کچھ کر بھی جائیں**۔ بہت آرزوئیں تھیں ساتھ ساتھ کچھ کر جانے کی۔ مگر دنیا عجیب چیز ہے: اختر الایمان اپنے لڑکپن کو پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوتا ہے، پھر اپنے آپ کو دنیا کے میلے میں گم ہوتے دیکھتا رہ جاتا ہے: حیران پریشان، گم سم سا۔ ادھر مرزا شروع ہو جاتے ہیں: ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے/ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔ اودھر علی گڑھ کے فیضان سے سرشار، دنیا کو بدلنے والی خواہشیں جو کسی عابد اللہ ہی کو زیب دیتی تھیں/ زیب دیتی ہیں۔

عابداللہ کے ساتھ ساتھ میں بہت دور تک نکل آیا؛ ساتھ تو بس اتنا ہی تھا کہ میکڈانل اور یونین اور الیکشن اور ہاسٹل میں جمنے والی روز کی مجلسیں: ع دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے! یونین کے ہنگامے وراليکشن کے قصے عابداللہ نے خوب خوب سنائے ہیں (یہ دیکھیے میں غازی کے بغیر ہی پہلا نام دہراتا تہراتا جارہا ہوں بس اس لئے کہ کام کا نہ سہی نام کا اتنا اشتراک ہی ہوتا جائے، ''غازی'' سے احتراز، شاید اسی سلسلے کی نفسیاتی گتھی ہے)۔ ساری آٹو بایو گرافی اسی سے بھری پڑی ہے اسی لئے بجا طور سے اس کا نام علی گڑھ سے علی گڑھ تک رکھا ہے، مجھے بار بار وہ مناظر اپنی طرف بے اختیار اس لئے کھینچتے رہے ہیں کہ عین مین وہی پورا عہد میرا عہد بھی رہا ہے، اور اچھا لگتا ہے جب اپنے عہد کے ایک پیارے دوست، ایک اچھے مقرر کی یاد آتی ہے جس کا نام عابداللہ تھا، جو پورے مجمعے کو بقول شخصے لوٹ لیتا تھا، ایسی تقریریں سحر بیانی کہلاتی ہیں۔ تقریر میں اس سحر بیانی کے ساتھ ساتھ بے پایاں بخشنے والے نے قلم میں بھی وہی سحر بیانی رکھ دی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ اس سات آٹھ سال کے عرصے میں مذکور عہد میں، جو یونین کے صدر ہوئے ان کی زبان میں تو سچ مچ جادو تھا، سعید انڈا، امین بلبلیا، نیر قدر، مبشر محمد خاں، شفیع قریشی سب تلوار کے تو دھنی تھے (تلوار بمعنی زبان) لیکن اہل قلم کوئی نہ ہوا سوائے عابداللہ غازی کے، جس کے پاس قلم بھی تھا زبان بھی۔

اور یہ بھی کہ جب وہ کہتا ہے کہ کامیاب اور بامراد زندگی گزاری تو میں مان تو لیتا ہوں کہ: اس نے ایسا ہی لکھا ہے! مگر دل نہیں مانتا، دل تو یہی کہتا ہے کہ ابھی اور اڑان بھرنا تھی، ابھی کئی منزلیں سر کرنا تھیں، ابھی تو کام کا اصل زمانہ آیا تھا۔

ادھر! لیکن! پھر کیا ہو جاتا ہے: سارے سپنے چکنا چور! اور سامنے انسان کی 'محدودیت! اور مجبوریت! عظیم و اعظم خدائے برتر، یہ تیری اشرف ترین مخلوق ایسی بدتر، کہ ایک جھٹکے میں سات افلاک سے اتر کر، زمیں کے کیڑوں، حقیر کیڑوں سے کچھ زیادہ ہی بد سے بدتر! عظیم و اعظم خدائے برتر!

فانی انسان! کہاں تک خدا بنے گا!!

عابداللہ غازی یونین کے پلیٹ فارم پر تقریر کے فن کا تو جادو جگاتا ہی تھا، تحریر میں بھی اگر فضولیات سے وقت بچ جاتا تو کچھ دوامی نقش چھوڑ جاتا۔ چھوڑی تو بس یہ آٹو بایو گرافی (یا کچھ مقولے) جس میں جابجا ان گنت flashes مل جاتے ہیں۔ ان کے اپنے بقول بہت کچھ کرنے کی آرزو تھی، بہت کچھ کرنے کی اہلیت تھی، صلاحیت تھی: اپنے طور سے بہت کچھ کیا بھی، مگر ساتھیوں کے اور خود اپنے حوصلے کے مطابق بہت کچھ کرنے سے رہ گیا! کیوں رہ جاتا ہے!

علی گڑھ سرسید کے ساتھ ان کے فرزندوں کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے:

سید کے ان نام لیوا بڑے فرزندوں کو، جن سے سید کے دھندلے پڑتے نقوشِ پا ایک بار پھر چمک اٹھتے ہیں، آخرِ شب ہی سہی! عابداللہ پچاس کی دہائی کے سید کے فرزندوں میں ایسا ہی ایک پیارا نام ہے جسے لوگ اب بھی (امریکا کو ہبہ ہو جانے کے باوجود!) علی گڑھ بہت محبت سے یاد رکھتا ہے، صحت و سلامتی کی بہت سی دعاؤں کے ساتھ!

●●●

تبصرہ

نام کتاب: شعرائے اردو کے تذکرے، خصوصیات و امتیازات

مصنف: عبدالرازق

ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۲۵

صفحات: ۱۸۴

سنہ اشاعت: ۲۰۱۶ء

مبصر: ب ع ر

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ ایم فل کا مقالہ ہے، اور عقیدت مندی کی آمیزش کے ساتھ لکھا گیا ہے، تو لازم ہے کہ کتاب پڑھ کر محنت و محبت کی داد دی جائے۔ مگر پھر یہ بھی ہوا ہے کہ بہ کمال احتیاط حنیف نقوی صاحب کا نام نہ دے کر، اور صرف ان کی کتاب کا ٹائٹل دے کر بطور مصنف اپنا ہی نام دینا کافی سمجھا جائے: یہ عجلت میں ہوا یا جان بوجھ کر لیکن

بلکہ ٹائٹل کے بعد کتاب کی **فہرست** میں بھی احتیاط مزید کی گئی کہ فہرست میں بھی حنیف نقوی کا نام جو ایک جگہ بھولے سے آسکتا تھا یعنی ''سوانح شخصیت اور ادبی خدمات''، یہاں بھی اصل کتاب کے مصنف جن پر یہ زیر تبصرہ کتاب لکھی گئی ان کا نام یہاں پر بھی نہیں آنے پایا۔ اس کی تلافی ظفر احمد صدیقی نے اپنے حرف دعا/ پیش لفظ میں پوری طرح کر دی ہے، (بلکہ حنیف نقوی صاحب کا نام بھی لے دیا ہے)، جو اس طرح ہے:

''پروفیسر حنیف نقوی (ف ۲۲ دسمبر ۲۰۱۲ء) صفِ اول کے محقق اور اعلیٰ درجے کے غالب شناس تھے۔ انھوں نے اپنی بلند پایہ تصانیف اور مضامین و مقالات کے ذریعے اردو میں تحقیق کی روایت کو فروغ بخشا ہے۔

'شعرائے اردو کے تذکرے' پروفیسر حنیف نقوی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر وکرم یونیورسٹی، اجین نے انھیں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی تھی۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۷۶ء میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے عمل میں آئی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور جناب مشفق خواجہ جیسے نامور محققین نے اسے اردو تحقیق میں گراں قدر اضافے سے تعبیر کیا ہے۔ اس کتاب کی تحقیقی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے اضافۂ مطالب کے ساتھ اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ علمی و ادبی حلقوں میں اب یہ کتاب ہر طرف معروف اور متداول ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نقوی صاحب نے 'نکات الشعرا' سے 'گلشن بے خار'

تک شعرائے اردو کے ۲۳ تذکروں سے متعلق جیسی عالمانہ گفتگو اس کتاب میں کی ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ہمارے یہاں موجود نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے متعلقہ تذکروں کے دستیاب قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ان کے تعین قدر سے متعلق فکر انگیز بحث کی ہے''۔

ڈاکٹر حنیف نقوی کی درجہ اول کے محقق کے مثالی تحقیقی کارنامے پر، لکھی گئی کتاب، جو ان کا ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ، جسے انگریزی میں بجا طور سے ان کا magnum opus کہا جاسکتا ہے، اس کتاب کی اشاعت اول (۱۹۷۶ء) کے بعد سے ادب کے سنجیدہ حلقوں میں حنیف صاحب کی لیاقت اور صلاحیت کا چرچا عام ہوگیا تھا، اتنا کہ ۱۹۹۵ء میں ان کے قدردانوں نے بڑی شان سے اس کتاب کا نظرثانی شدہ ایڈیشن نکالا، اب عام طور سے رشید حسن خاں، حنیف نقوی، اور شیام لال کالڑا عابد پشاوری کے نام محققوں کی آخری کھیپ میں کمال عزت سے لیے جاتے ہیں، مشفق خواجہ کی سربراہی میں لائق محققوں کی ایک بڑی ٹیم پڑوس میں بھی سامنے آتی گئی ہے۔

ڈاکٹر حسن عباس نے تو بڑا ثواب کما لیا کہ حنیف نقوی صاحب کی زندگی ہی میں انھیں ایک اچھا تحفہ ارمغان علمی کے نام سے پیش کردیا، تاہم یہ زیر تبصرہ کتاب بھی ایک اعتبار سے حنیف صاحب کے لئے ایک نذر ہی ہے جس میں ڈاکٹر عبدالرزاق نے حنیف صاحب کے شاہکار کا خلاصہ اور اس کا تجزیاتی مطالعہ بہت محبت اور عقیدت سے کیا ہے، اور بڑی تفصیل اور وضاحت سے اس کارنامہ کو از سرِ نو زندہ کردیا ہے۔

کتاب کے مشتملات اس طرح ہیں:

● سوانح، شخصیت اور ادبی خدمات (ایک اجمالی جائزہ) ● تذکرہ نگاری بہ حیثیت فن۔ عربی ● فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت ● اردو تذکرہ نگاری (آغاز سے شیفتہ تک) ● نکات الشعرا اور دوسرے ابتدائی تذکرے (نکات الشعرا؛ گلشن گفتار؛ گلشنِ راز یا تذکرۂ ریختہ گویاں؛ ریاضِ حسنی؛ مخزن نکات۔ چمنستان شعرا سے گلشن سخن تک؛ چمنستان شعرا؛ طبقات الشعرا؛ تذکرۂ شعرائے اردو؛ تذکرہ شورش؛ مسرت افزا؛ گل عجائب؛ گلزار ابراہیم؛ گلشن سخن) ● تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا اور معاصر تذکرے (گلشن ہند؛ تذکرۂ عشقی؛ طبقات سخن؛ تذکرۂ جگر) ● طویل اور جامع تذکرے (عیار الشعرا؛ عمدۂ منتخبہ؛ مجموعہ نغز؛ گلشن بے خار) ● حنیف صاحب کی کتاب کی خصوصیات و امتیازات۔

نقوی صاحب کی کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں نقوی صاحب کے خاندان، ان کی تعلیم و تربیت، تدریسی خدمات، ادبی خدمات اور دیگر سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاکہ ان کی شخصیت واضح طور پر ہمارے سامنے آسکے۔ دوسرے حصے مین کتاب کے آٹھوں ابواب کا فرداً فرداً تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ تیسرا حصہ حاصلِ مطالعہ ہے۔ یعنی کتاب کے مطالعہ کے بعد اس کی جو خصوصیات سامنے آئیں ان کو

مثالوں کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ اس کتاب کی دو اشاعتیں عمل میں آئی ہیں ایک نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے ۱۹۷۶ء میں اور دوسری اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے ۱۹۹۸ء میں۔ زیر تبصرہ کتاب میں اسی آخری ایڈیشن کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

حنیف صاحب کی ایک ترتیب **آثار غالب** کے سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو تو بہتر ہے:

خدا بخش سے جو ایڈیشن آثار غالب کا نکلا تھا، دراصل اس کتاب کے مرتب اول قاضی عبدالودود ہیں، اور مرتب ثانی ڈاکٹر حنیف نقوی۔ ٹائٹل پر صرف مرتب اول کا نام دینا ضروری سمجھا گیا اور اندر پوری وضاحت کے ساتھ بطور مرتب ثانی حنیف نقوی صاحب کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قاضی صاحب کے مرتبہ اس مجموعہ کے بارے میں تحقیق مزید کے نتیجہ میں کئی ضروری اضافے اور تصحیحات حنیف کا کارنامہ ہے، لیکن: وہ سیریز جس میں قاضی عبدالودود صاحب کی کتابیں خدا بخش سے بیس بائیس جلدوں میں چھپیں، اصل مرتب کا لحاظ رکھتے ہوئے ان ہی کا نام (یعنی قاضی صاحب کا نام ہی) ٹائٹل کے صفحہ پر دینا مناسب تر سمجھا گیا تھا، تاہم حنیف صاحب کی ژرف نگاہی اور نئے تحقیقی نکات کے قابل قدر اضافوں کا پورا اعتراف کیا گیا تھا، اور مرتب ثانی کی حیثیت سے واضح طور سے ڈاکٹر حنیف نقوی ہی کا پورا اعتراف تھا؛ اسی حیثیت سے ان کا نام بھی، اس کتاب پر ثبت تھا۔ کمی صرف یہ رہ گئی کہ ٹائٹل پیج پر بھی، ایسی ہی وضاحت کے ساتھ ان کا نام بطور مرتب ثانی دے دینا تھا۔ یہ فروگذاشت ڈاکٹر گیان چند جین کے علم میں آئی تو، حنیف صاحب ان کے بہت عزیز شاگرد تھے، جین صاحب نے اس پر گرفت کی، اور بطور خاص ایک یا دو مقالوں میں اپنے ملال کا اظہار کیا۔ جین صاحب کے اس معاملہ میں کود پڑنے کی اصل وجہ کچھ اور بھی تھی، یعنی بغض علی زیادہ تھا اور حب معاویہ کم۔ لائبریری کی طرف سے جین صاحب ایک خاص وجہ سے قاضی عبدالودود صاحب سے کبیدہ خاطر ہو گئے تھے، اور کوئی ایسا موقع نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، جس سے قاضی صاحب ان کی زد سے نکل جائیں۔ چنانچہ جین صاحب نے حنیف نقوی صاحب کی حمایت میں لکھا اور خوب خوب لکھا؛ کافی مبالغہ کے ساتھ لکھا اور طول کلامی میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ جہاں تک خدا بخش لائبریری کا تعلق ہے، حنیف صاحب کی قدردانی میں کبھی کوئی کمی نہیں پائی گئی، اور آثار غالب کے علاوہ ان کی مرتبہ دو کتابیں اور بھی خدا بخش نے اہتمام سے شائع کیں، جو خود زیر تبصرہ کتاب کے سوانحی حصہ میں اس طرح درج ہیں:

''مرزا غالب کے پنج آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ (عکسی ایڈیشن)۔ اور۔ دیوان ناسخ کا ایک قدیم خطی نسخہ (عکسی ایڈیشن)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، مطبع پاکیزہ آفسیٹ، ۱۹۹۷ء''۔

یہ چند سطور ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر حسن عباس کی مرتبہ ارمغان علمی (۲۰۱۰ء) میں شامل شمس الرحمٰن

فاروقی کا ایک دلچسپ کمنٹ پڑھتے اور لطف اٹھاتے جائیں؛ لطف مزید اس لئے بھی کہ یہ مضمون جو حنیف صاحب کی حیات ہی میں لکھا گیا تھا اس کا عنوان بڑا دلچسپ تھا، یعنی ''حنیف نقوی کی جاسوسیاں'':

''حنیف نقوی کو میں ایک مدت سے پڑھتا رہا ہوں اور شاید ہی کوئی تحریر ان کی ایسی ملی ہو جسے پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ نہ ہوا ہو، یا میری کوئی غلط فہمی دور نہ ہوئی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانے تک ان کی شہرت کچھ 'شہرت شکن' لوگوں کی سی تھی۔ یعنی وہ بڑے بڑے محققوں کی غلطیاں یا فروگذاشتیں ڈھونڈنے اور بیان کرنے میں ماہر تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کے کام کی بعض ایسی خوبیاں مجھ پر کھلیں جن میں مجھے ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ مثلاً ایک تو یہ کہ اگر کسی لفظ کے بارے میں سوال ہو کہ یہ کب استعمال ہوا اور کن کن پرانے شاعروں کے یہاں یہ لفظ نظر آتا ہے، تو تھوڑے سے تأمل یا تھوڑی سی تلاش کے بعد حنیف نقوی آپ کے سوال کا شافی جواب دے دیں گے۔ یا مثلاً اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کوئی شاعر اور خاص کر کوئی نسبتاً گمنام شاعر، کس کا شاگرد تھا اور کن تذکروں میں اس کا ذکر ملتا ہے، تو اس کا جواب بھی حنیف نقوی کے یہاں سے فوراً یا تقریباً فوراً مل جائے گا''۔

ایک دلچسپ نکتہ آپ اوپر پڑھ چکے۔ ایک نکتہ اور: یہ دنیا تلافیِ مافات کی دنیا ہے، ابھی ذکر ہوا کہ قاضی صاحب کی مرتبہ **مآثر غالب**، پر انکا نام تو سرِ ورق پر آیا، حنیف نقوی صاحب کا نام اندرونی ورق پر ہی دیا گیا، اور قاضی صاحب کو لاشریک رکھا گیا، جس پر گیان چند جین صاحب نے اعتراض کیا کہ حق حقدار کو پوری طرح نہیں پہنچا۔ اب برسوں بعد حنیف نقوی صاحب کی معرکہ آرا کتاب کی ''خصوصیات و امتیازات'' پر عبدالرزاق صاحب (نگراں ظفر احمد صدیقی صاحب) کی جو کتاب قاضی صاحب کی کتاب کے بیس تیس برس بعد نکلی اس میں حنیف نقوی صاحب کا نام ٹائٹل سے لے کر فہرست تک کے صفحات سے غائب ہے اور جیسے مدتوں پہلے گیان چند صاحب نے استغاثہ دائر کیا تھا، آج تاریخ کو دوہرانے کے لئے حنیف نقوی صاحب کی طرف سے گیان چند صاحب کی نیابت میں ایک استغاثۂ مزید ہم دائر کر رہے ہیں، کہ غریب مصنف (پروفیسر حنیف نقوی) کا نام کسی نہ کسی طور سرِ ورق پر آنا چاہیے تھا۔ جب بھی آجائے اچھا۔ یعنی اگلے ایڈیشن میں عبدالرزاق صاحب کی کتاب کا نام اسطرح کر دیا جائے تو اصل مصنف کی روح خوش ہو جائیگی: ''پروفیسر حنیف نقوی کی کتاب شعرائے اردو کے تذکرے: خصوصیات و امتیازات''

●●●

مراسلہ

سرسید کی تحریروں میں مرحوم ہندو دوستوں کا ذکرِ خیر

ڈاکٹر اصغر عباس

اہل کتاب پر، مہر محمد خاں مالیر کوٹلوی نے مضمون کے آخر میں آنجہانی اور مرحوم کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے پڑھ کے مجھے سرسید یاد آ گئے۔ شہاب صاحب لکھتے ہیں :

عام طور پر اگرچہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ مسلمان ہندو وفات یافتگان کو ''آنجہانی'' اور مسلمان مردگان کو مرحوم کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر یہ کوئی بدگوئی یا بدزبانی نہیں، صرف اظہار حقیقت کی کئی صورتوں میں سے دو صورتیں ہیں، مگر یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں کہ ہر مسلمان دنیا سے گزر جانے والے ہر غیر مذہب، یا ہندو ہی کہیے، وفات پا جانے والے کا ذکر ''آنجہانی'' کے لفظوں سے کرتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندو مر جانے والوں کے لئے ''مرحوم'' بھی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی آج کی بات نہیں سالہا سال سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے اور ایسے جذبات کا ظہور ذاتی واقفیت اور تعلق قلبی کی بنا پر ہوتا ہے، چنانچہ اس وقت میرے سامنے شمس العلماء مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالیؔ پانی پتی کی سوانح حیات بعنوان ''تذکرہ حالی'' جلد اول مرتبہ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی جو مولانا حالی کے جشن صد سالہ کے موقعہ پر اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حالی بک ڈپو پانی پت کی طرف سے شائع کی گئی تھی، کھلی پڑی ہے، اس کے صفحہ ۱۵۴-۱۵۳ پر مولانا حالی کا ایک تعزیتی خط درج ہے جو آپ نے اپنے ایک عزیز دوست لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی کی وفات پر بطور تعزیت، مرحوم کے لڑکے کے لالہ چندو لال کو لکھا تھا، اور جو حسب ذیل ہے:

عزیزی و شفیقی سلمہ، آپ کی تحریر سے میرے نہایت دلی دوست لالہ بہاری لال مشتاق مرحوم کی وفات کا حال معلوم ہوا، جس کا صدمہ کبھی دل سے فراموش نہیں ہو سکتا۔ میرے دہلوی دوستوں میں سے افسوس ہے کہ ایک خاص اور مخلص دوست کم ہو گیا، جس کا بدل ملنا مشکل ہے، ایسے وضعدار، محبت کے پتلے، حاضر غائب یکساں اور اپنے اصول کے فدائی، بہت کم ہوتے ہیں خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو بخشے اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو صبر عنایت کرے...... زیادہ دعا۔ الطاف حسین حالیؔ از پانی پت، یکم اکتوبر ۱۹۰۸ء۔

حالی سے قبل خود حالی کے ممدوح **سرسید** نے بھی یہی روش اپنائی تھی، جسکا ثبوت میری مرتبہ کتاب ''سرسید کی تعزیتی تحریریں'' سے ملتا ہے، سرسید نے جا بجا اپنے تعزیت ناموں میں جن جن ہندو دوستوں کی تعزیت کی ہے، انھیں التزام کے ساتھ **مرحوم** لکھا ہے، جیسے : کیشب چندر سین مرحوم، بابو ابھیناش چندر مرحوم، مہاراجہ بہادر بنارس مرحوم، وغیرہ۔

•••

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی کی نئی کتاب

مسائل ومباحث

پروفیسر شروانی کی نئی کتاب مسائل ومباحث حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔اس میں ۱۹۴۹ء سے ۲۰۱۷ء تک کے سیاسی مسائل ومباحث پر تحریریں شائع ہوئی ہیں۔جن میں مسلمانانِ ہند، ہندوستان اور بیرونِ ہند سے متعلق امور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ان میں تقریباً ۷۰ برس کے حالات وکوائف آجاتے ہیں۔

کتاب کی ضخامت ۴۳۷ صفحات ہے اور قیمت =/۵۰۰ روپے ہے۔

متعدد مشاہیر کی وفیات بھی شامل ہیں۔

ناشر

براؤن بکس پبلی کیشنز، نئی دہلی 110025

+91-9818897975,0571-2700088

ملنے کے پتے:

(۱) براؤن بکس، علی گڑھ

(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ

تصانیف پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

۱-	میر کارواں ابوالکلام آزاد	۴۰۰روپے
۲-	انڈیا ونس فریڈم - ایک مطالعہ	۴۰روپے
۳-	شذرات ریاض شروانی	۳۵۰روپے
۴-	کتابوں کے درمیاں	۵۰۰روپے
۵-	مقالات ریاض شروانی	۴۰۰روپے
۶-	انساں کیسے کیسے	۳۰۰روپے
۷-	دھوپ چھاؤں (زمانہ طالب علمی کے حالات)	۲۰۰روپے